شبیہ مبارک نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ المتخلص غالب مدظلہ

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہیم



فروری ۱۹۶۳ء



بیاباں در بیاباں،، سے ''گلستان در گلستان'': کوئٹہ اور قلات ڈویژن کے کم ترقی یافتہ علاقوں میں ترقی و خوشحالی کے منصوبوں پر عمل — صدر پاکستان کا ارباب حل و عقد سے تبادلۂ خیال

"احوال واقعی"



جناب محمد علی مرحوم

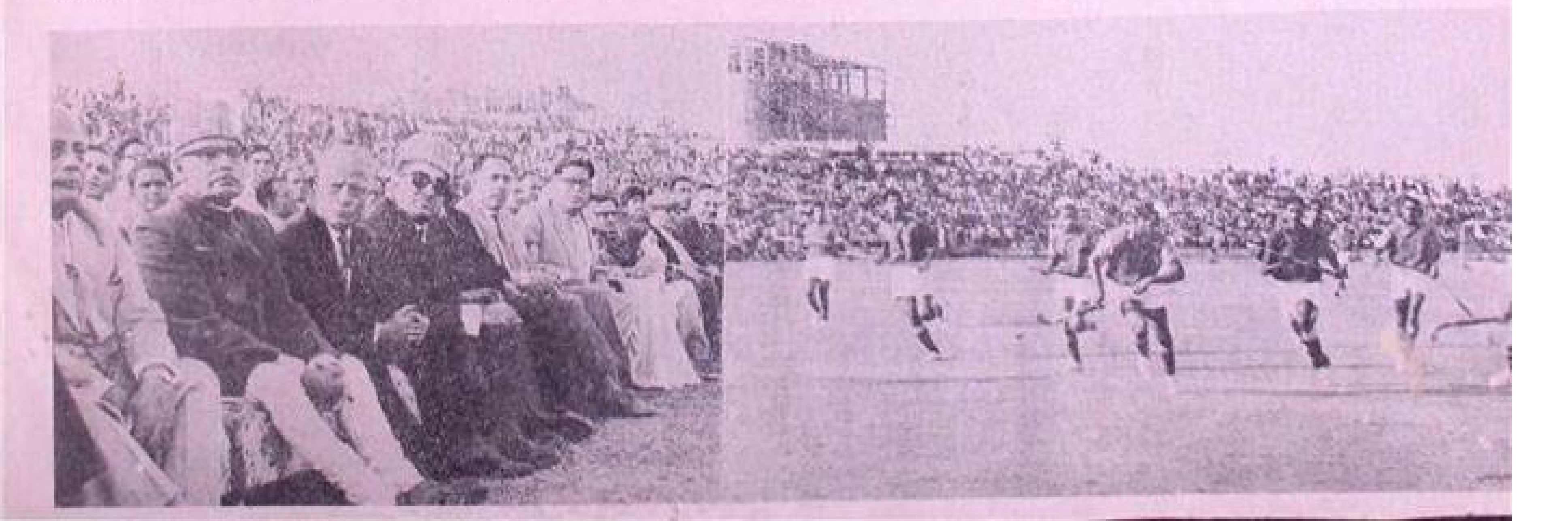
وزیر امور خارجہ (۱۹۰۹ء ۱۹۶۳ء)

,, دیگر زساز بیخودیٔ ما صدا مجو
آوازے از گسستن تارِ خودیم ما ،،



,,: ڈھاکہ میں ملک کے ذیلی دارالحکومت کی تعمیر

دگی اندر دویدن است، ماثیست ,,: کھیل کے میدان میں سرخروئی — پاکستان کی ہاکی ٹیم بمقابلہ ہاکی ٹیم کینیا (ڈھاکہ اسٹیڈیم)



چناب سے پدما تک

(عوامی کہانیاں)

ہمارا ملک اس لحاظ سے کافی ممتاز و منفرد ہے کہ اس کا دامن طرح طرح کی اچھوتی ، دلچسپ ، عوامی کہانیوں کے گلہائے رنگ رنگ سے لبریز ہے ۔ مغربی پاکستان کی دنیا دل آویزیوں کا ایک بو قلموں مرقع ہے تو مشرقی پاکستان کی بھی ایک اپنی ہی دنیا ہے ، اپنی ہی فضا ہے ، نفیس ، ھری بھری ، مسحور کن ۔ مگر فرزندان کوہ و دمن اور ریگ و صحراؤں یا نرم کومل دوب میں جھلکتی ، چھلکتی ، کنمناتی ندیوں اور امڈتی گھٹاؤں کے دیس والے ہوں ، ان سب کے ذہنوں ، تجربوں اور احساس نے جن جن کہانیوں کو بیساختہ طور پر جنم دیا ہے وہ ایک ہی چیز کی غماز اور عکاس ہیں ۔ عوام کے اپنے دل کی دھڑکنیں ، ان کی حیات کی جھلکیاں اور سادہ و رنگیں جذبات و احساسات کی بے لوث تصویریں ۔ ہر کہانی پر تخیل کی کارفرمائی ہے یا بیان واقعہ کی تفسیر جمیل ۔ مشرقی پاکستان ہو یا مغربی پاکستان ، ان کی روحیں ایک ہی ہیں ۔ اس لئے ان عوامی کہانیوں کا مطالعہ ہمیں ایک دوسرے سے قریب تر لانے اور باھمی تعارف و یگانگت کا احساس بیدار کرنے میں بھی مدد دیتا ہے ۔

چند جھلکیاں

تعارف : (رفیق خاور) : ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ جس میں عوامی کہانیوں کے مخصوص تیوروں پر مرتب نے ایک بھرپور روشنی ڈالی ہے ۔

اٹک کے اس پار : موسیٰ خان گل مکئی ، آدم درخانئی ، محبوبۂ جلات ، یوسف کڑھ مار ، شھی تور دلئی ، زرسانگہ ، بھرام و گل اندام ۔

پنج ند : ھیر رانجھا ، ھیر سیال ، مرزا صاحباں ، سوھنی مہیوال ، یوسف زلیخا ، مینڈھرا موسل ، سمی ۔

وادیٔ مہران : سسی پنوں ، سرسسی ، مومل رانو ، عمر ماروی ، سر مارونی ، لیلیاں چنیسر ، نوری جام تماچی

وادیٔ بولان : لیلیٰ مور

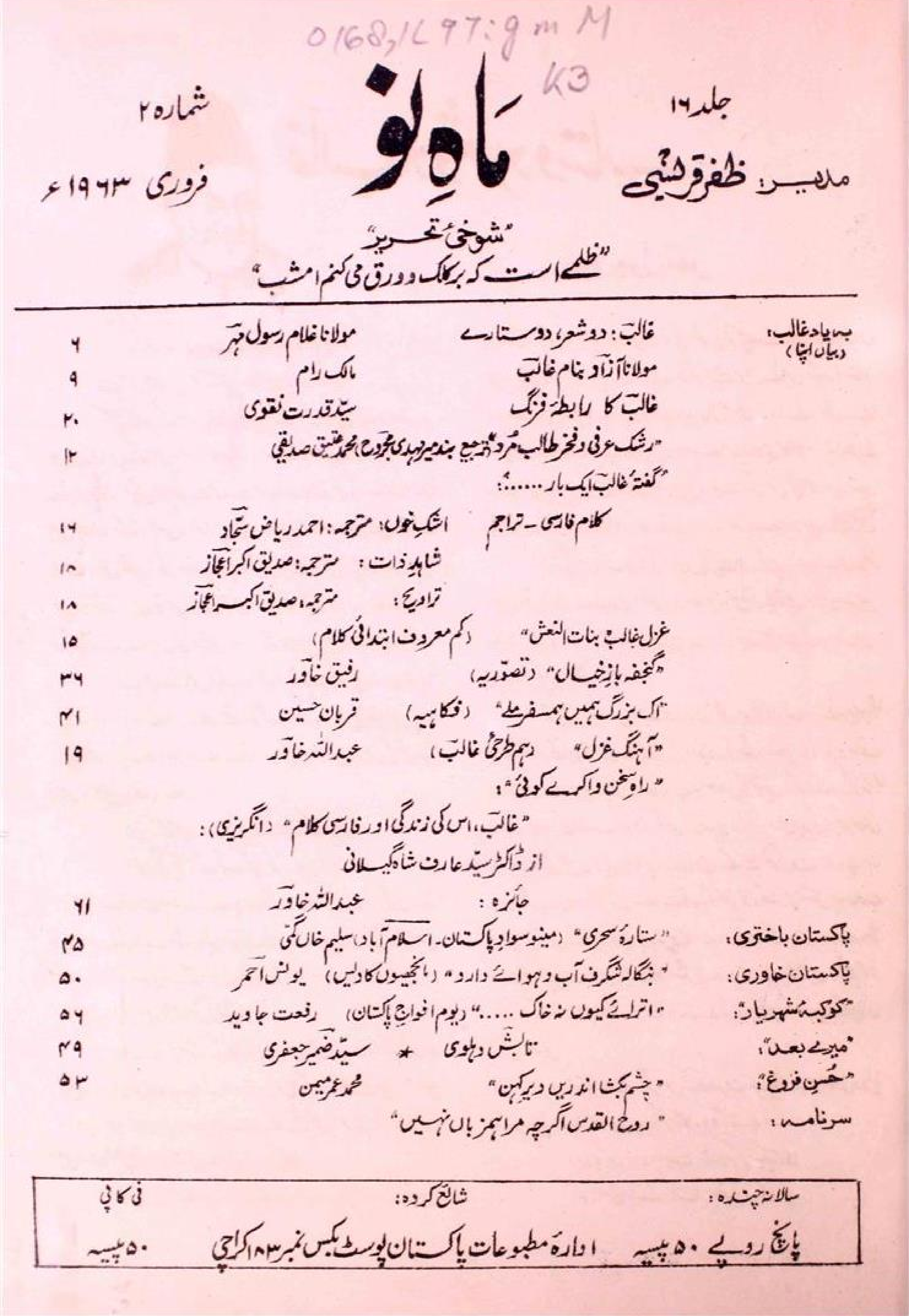
کشمیر : گلعذار شہر عاج

مشرقی پاکستان : مہوا ، گونائی بی بی ، دیوانی مدینہ ، کاجل ریکھا ، آئینہ بی بی ، کنول کنڈ

اس مجموعہ کا ایک اہم و دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ہر کہانی کے ساتھ اس کی ایک مختصر منظوم جھلک بھی پیش کی گئی ہے

قیمت صرف دو روپے

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ ۔ کراچی



جلد ۱۶

ماہِ نو

شمارہ ۲

مدیر: ظفر قریشی

فروری ۱۹۶۳ء

"شوخیٔ تحریر"

"طلسمے است کہ بر کلک و ورق می کنم امشب"

سالانہ چندہ: پانچ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ: ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

فی کاپی: ۵۰ پیسہ

غالب: دو شعر، دو ستارے

غلام رسول مہر

درتہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانۂ

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

کسی شاعر کے کلام پر نقد و تبصرہ کے سلسلے میں ایک دستور یہ بھی ہے کہ اس کے بعض اشعار کا موازنہ اساتذۂ شہیر کے بعض اشعار سے کیا جائے، لیکن ظاہر ہے کہ اسے فضیلت و برتری کی مستند دستاویز نہیں سمجھا جا سکتا۔ بعض اشعار میں ایک استاد کا دوسرے پر سبقت لے جانا بالکل ممکن، بلکہ اغلب ہے، مگر من حیث الکل ترجیح کا فیصلہ یوں نہیں ہو سکتا۔ میں تو اس کا بھی قائل ہوں کہ ایک نو آموز اتفاقاً ایسا شعر کہہ سکتا ہے، جس کی مثال اکابر کے کلام میں بھی شاید ہی مل سکے۔

"آبِ حیات" میں ایک واقعہ مرقوم ہے کہ ایک دن مرزا رفیع سودا مشاعرے میں بیٹھے تھے۔ لوگ باری باری اپنی غزلیں پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحبزادے نے جس کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی غزل پڑھی۔ مطلع یہ تھا: ؎

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

گرمیٔ کلام سے سودا بھی چونک پڑے۔ پوچھا: "کس نے مطلع پڑھا؟" لوگوں نے صاحبزادے کی طرف اشارہ کیا۔ سودا نے بہت تعریف کی۔ کئی مرتبہ مطلع پڑھوایا اور کہا: "میاں لڑکے! جوان تو ہوتے نظر نہیں آتے۔" خدا کی قدرت کہ انہیں دنوں میں لڑکا جل کر مر گیا۔

یہاں سوال سودا کی پیشگوئی یا اس کے ثبات و محکمیت کا نہیں، سوال صرف یہ ہے کہ بارہ تیرہ برس کے لڑکے نے ایسا مطلع کہہ دیا، جو مشاق اور مسلّمہ استاد کے لئے بھی باعثِ فخر تھا۔ سودا بھی ایسے مطلع کو اپنی شان سے فروتر نہ سمجھتے۔

غرض اس قسم کا موازنہ کسی ایک کی فضیلتِ کُلّی کا معیار نہیں بن سکتا، لیکن یہ طریقہ محاسن ردقائق شعر کی توضیح کے لئے بہت موزوں ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اگر ایک نقّاد ایسے موازنے میں ایک استاد کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے تو اسے بہرحال مسلّم مانا جائے۔ ممکن ہے، کسی دوسرے صاحبِ ذوق کو دوسرے استاد ہی کا کلام بہتر نظر آئے اور وہ اسی کی خوبیوں کے مختلف پہلو پیش کر دے، مگر اس طرح محاسنِ اشعار کے نکات بخوبی بروئے کار آ جاتے ہیں اور یہ امر بجائے خود مفید و نفع بخش ہے۔

زندگی میں انسان کو گوناگوں تجربے ہوتے ہیں۔ اربابِ غور و فکر انہیں تجربات سے بنیادی اصول و حقائق وضع کر لیتے ہیں، لیکن یہ چیز دقیقہ سنجی اور دُور اندیشی کی محتاج ہے اور دقیقہ سنج نظر سے ہر انسان بہرہ مند نہیں ہوتا۔

تقریباً ہر فرد اس حقیقت سے آگاہ ہوگا کہ انسان نے سر پر بھاری بوجھ اُٹھا رکھا ہو تو اس کے چلنے میں اختیار کی جگہ اضطرار رونما ہو جاتا ہے۔ وہ بوجھ سے دبا ہُوا پاؤں اٹھاتا ہے تو سنبھل کر نہیں رکھ سکتا اور گرانباری اسے راستے کے نشیب و فراز یا کسی دوسری آزار رساں چیز کی دیکھ بھال کی مہلت بھی نہیں دیتی۔ چنانچہ ایسے آدمی کے لئے ٹھوکروں سے بچے رہنا یا سنگریزوں اور کانٹوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن جس شخص کے سر پر کوئی بوجھ نہ ہوگا، وہ اس قسم کے ہر خطرے سے مامون رہے گا۔ کیچڑ سے دامن بچائے گا۔ سنگریزے اور کانٹے راستے میں دیکھے گا تو اٹھا کر ایک طرف پھینک دے گا تاکہ بے خبری میں کسی دوسرے کے پاؤں زخمی نہ ہوں۔

یہ عام تجربہ ہے، مگر اس سے صرف مرزا غالب ہی کا دل و دماغ ایک اعلیٰ درجے کا اصول پیدا کر سکا۔ وہ کہتا ہے: ؎

براہِ کعبہ زادم نیست، شادم کز سبکباری

بہ رفتن پائے بر خارِ مغیلانم نمی آید

"میں نے کعبے کا قصد کر رکھا ہے، سفر میں جو ضروری چیزیں درکار ہوتی ہیں، وہ پاس نہیں، تاہم خوش ہوں کہ اگر وہ چیزیں پاس ہوتیں تو سر پر بھاری بوجھ اٹھانا پڑتا اور راستے کی آزار رساں چیزوں سے بچتے ہوئے سفر طے نہ کیا جا سکتا۔ اب بوجھ سے آزاد ہوں اور ببول کے کانٹوں سے بچتا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں"۔

یوں یہ اصول سامنے آگیا کہ دُنیا کی کوئی بھی حالت نہ علی الاطلاق اطمینان بخش ہے اور نہ علی الاطلاق غیر اطمینان بخش۔ ایک پہلو اطمینان کا ہے تو ساتھ بے اطمینانی بھی موجود ہے۔ جس کے پاس زادِ راہ ہو، اس کے لئے جراحتِ پا کے خطرے موجود ہیں۔ بے زاد آدمی کو ایسا کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا، البتہ بے زاد ہونا بجائے خود جسِ تشویش کا باعث ہے، اس سے وہ بچ نہیں سکتا۔

اساتذہ ایک دوسرے کے کلام سے استفادہ بھی کرتے رہتے ہیں، جسے حق ناشناس لوگ سرقہ قرار دے لیتے ہیں۔ بعض اوقات یہ استفادہ علم و شعور پر مبنی ہوتا ہے۔ مثلاً کسی استاد کا کوئی شعر دیکھا تو خیال ہوا کہ مضمون اچھا ہے، مگر ایسے انداز میں نہیں بندھ سکا، جس سے اس کی تمام خوبیاں پوری طرح نمایاں ہو جاتیں۔ چنانچہ بعض نکات کا اضافہ کر کے اسے دوبارہ باندھا اور اس کی شان بدرجہا بلند تر کر دی۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر کو کوئی پرانا مضمون باندھتے وقت یاد ہی نہ رہے کہ یہ پہلے بندھ چکا ہے۔ تمام متاخرین متقدمین کے کلام کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور مختلف مضامین ان کے ذہن میں محفوظ ہوتے جاتے ہیں۔ پھر ہر شاعر اپنے مشاہدے، احساس اور تخیل سے نئے نئے مضامین پیدا کرتا ہے۔ بعض اوقات اس کے حافظے سے کوئی پرانا مضمون نکل کر اچانک سامنے آجاتا ہے۔ اگر ایسا کوئی مضمون متقدم کے کلام سے بہتر طریق پر بندھ جائے تو سمجھنا چاہئے کہ اصل مضمون متاخر کا ہو گیا، لیکن اگر بہتر نہ بندھ سکے تو ماننا پڑے گا کہ ایک استاد کے کلام کو بگاڑ دیا۔

مرزا غالب کے کلام میں بھی استفادے کی مثالیں ملتی ہیں جس طرح تمام دوسرے اساتذہ کے ہاں ایسی مثالیں موجود ہیں، مگر میری نظر سے اب تک مرزا غالب کا کوئی شعر نہیں گزرا، جو استفادے پر مبنی ہو، لیکن بدرجہا بہتر انداز میں نہ بندھا ہو خواہ مرزا کا استفادہ علم و شعور پر مبنی سمجھا جائے یا اسے لاشعور کا نتیجہ قرار دیا جائے۔

پہلا شعر:

مرزا غالب کا ایک مشہور شعر ہے:

نہ لٹتا دن کو تو کیوں رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

نفسِ مضمون میں اس سے ملتا جلتا ایک شعر نظیری نیشاپوری کا بھی ہے:

بہ عُریانی ازاں شادم کہ از تشویش آزادم
گریبانے ندارم تا کسے از دستِ من گیرد

دیکھئے، دونوں کا بنیادی مضمون ایک ہے، یعنی دنیا کا ساز و سامان اور علائق انسان کے لئے تشویش و اضطراب کا سرچشمہ ہیں، ان علائق سے آزاد رہنا باعثِ اطمینان ہے۔ لیکن دونوں کے بیان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نظیری کہتا ہے: "میرے پاس لباس تک نہیں، لہٰذا تشویش سے فارغ البال ہوں۔ اگر کوئی چیز پاس ہوتی تو یہ اندیشہ رہتا کہ چھین لی جائے گی۔ اب ایسی کسی صورت کے وقوع کا امکان ہی نہیں"۔

تاہم یہ ادعائے محض ہے۔ مرزا غالب نے ادعا کافی نہ سمجھا۔ وہ کہتے ہیں: "میرے پاس ساز و سامان تو تھا، مگر دن کے وقت رہزن لُوٹ کر لے گیا اور میں قلاش محض رہ گیا۔ جب تک سامان تھا، خبرداری کی تشویش موجود تھی۔ رات کے وقت اطمینان کی نیند نہیں آتی تھی، کیونکہ چوری کا اندیشہ لاحق رہتا تھا، اب رات کو بے خبر سوتا ہوں اور رہزن کو دعا دیتا ہوں کہ اگر وہ دن کے وقت سب کچھ ہتھیا نہ لیتا تو میرے لئے رات کو بے خبر ہو کر سونا کیونکر ممکن تھا؛

پھر مرزا کی دقیقہ سنجی کے کمالات دیکھئے:

(۱) انہوں نے دو شخص پیدا کئے، جو سامان لے جا سکتے تھے، ایک رہزن، جو دن دہاڑے زور و قوت سے سب کچھ لُوٹتا ہے، دوسرا چور، جو رات کو چھپ چھپا کر سامان اُٹھاتا ہے۔

(۲) یقیناً رہزن اور چور دونوں موجبِ تشویش ہیں، لیکن رہزن دن کو لوٹتا ہے، اس لئے نیند میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ چور رات کو چوری کرتا ہے اور اس کے متعلق اندیشہ رات کی نیند حرام کر دیتا ہے۔

(۳) انسان رات ہی کو سوتا ہے اور اسے اطمینان و فارغ البالی کی سب سے بڑھ کر ضرورت رات ہی کو پیش آتی ہے۔ رہزن نے دن کو دستِ تغلب دراز کیا اور رات کے لئے اطمینان کا سامان فراہم کر دیا۔ لہٰذا مرزا کے نزدیک وہ دعا کا مستحق ٹھہرا۔

(۴) پھر مرزا نے یہ پورا واقعہ اس انداز میں پیش کیا، گویا یہ ہو چکا ہے، یہ نہیں کہ ہونے والا ہے۔

اس طرح نظیری کے مقابلے میں پورے واقعہ کو ایک وقوعی اور عامۃ الورود صورت دے دی اور مضمون کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ گویا اگر استفادہ بھی کیا تو اس شان سے کہ مضمون نظیری کا نہ رہا، اپنا بنالیا۔

دوسرا شعر:

مرزا غالب کا ایک شعر ہے:

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اس سے ملتا جلتا ایک شعر نظیری کا بھی ہے، جس میں وہ کامِ نہنگ تک استعمال کر گیا ہے۔ کہتا ہے:

تمنائے گہر سرگشتہ ام دارد بہ دریائے
کہ در ہر گام صد جا راہ بر کامِ نہنگ افتد

یعنی گوہر کی آرزو مجھے اس سمندر میں سرگرداں لئے پھرتی ہے جہاں راستہ اس درجہ خطرناک ہے کہ قدم قدم پر سیکڑوں نہنگ منہ کھولے بیٹھے ہیں۔

یقیناً مضمون نہایت اچھوتا ہے اور اس حقیقت کا آئینہ دار کہ انسان انتہائی مشکلات سے گزرے بغیر کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ اور کسی بلند و شایاں مقصد پر نہیں پہنچ سکتا۔ گوہر کی آرزو میں سرگشتگی یعنی تردد و بیقراری انسان کو تمام مشکلات سے بے پروا کر دیتی ہے۔

مرزا غالب نے اس مضمون میں اتنی جدتیں پیدا کر لیں کہ اسے اپنا مستقل مضمون بنالیا، مثلاً فرمایا:

۱۔ ہر موج ایک جال لئے ہوئے ہے اور مشاہدہ اس کا شاہد ہے۔

۲۔ یہ جال کیسے ہیں؟ ڈوریوں سے تیار نہیں ہوئے، بلکہ سیکڑوں مگرمچھ منہ کھول کر بیٹھ گئے۔ اس طرح ان کے تسلسل و تواتر سے ہر جال کے حلقوں نے ترکیب پائی۔

۳۔ خطرات و مہالک کا یہ نہایت دہشت ناک منظر پیشِ نظر لاکر سوچتے ہیں کہ قطرے کو اسی ماحول میں گوہر بننا ہے۔ وہ جب تک ان تمام خطروں کو صبر و استقامت سے انگیز نہ کرے گا۔ اس کے لئے درجۂ کمال پر پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔

۴۔ تمام خطرات بیان کر دئے، مگر معین طریق پر یہ نہ بتایا کہ عملِ ارتقا میں قطرے پر کون کون سی آفتیں آئیں گی، اس لئے کہ ان کا تعین ہو ہی نہیں سکتا تھا اور عدمِ تعین کی حالت میں بھی شعر پڑھنے والا خود خطرات کا اندازہ کر سکتا ہے۔ حقیقتہً عدمِ تعین زیادہ لطف انگیز ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ شعر بھی نظیری کے شعر سے بدرجہا بلند تر ہے، اگرچہ "کامِ نہنگ" کی ترکیب صاف ظاہر کر رہی ہے کہ مرزا کا شعر نظیری کے شعر سے مستفاد ہے۔

پھر عرض کرتا ہوں کہ یہاں نظیری اور غالب کا موازنہ مقصود نہیں، نظیری بہت بڑا شاعر ہے اور محض دو چار یا دس بیس اشعار میں مرزا غالب یا کسی دوسرے شاعر کی افضلیت ثابت بھی ہو جائے تو نظیری کے مقام و مرتبہ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ میرے نزدیک تو اساتذہ میں تفاضل کا طریقہ ہی نامناسب ہے۔ سب نے بہ حیثیتِ مجموعی حقائق کے شہوار گوہروں سے ادبیات کے دامن بھرے اور وہ سب خوش ذوق انسانوں کے احترام و سپاس کے مستحق ہیں۔

عرفی اور اقبال:

اساتذہ میں ایسی مثالیں بے شمار ملتی ہیں کہ ایک کے پیدا کئے ہوئے مضمون میں دوسرے نے نئی خوبی اور نئی شان پیدا کر دی۔

سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ طور پر موسیٰؑ کو خدا سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا تو خدا نے پوچھا: "موسیٰ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟" اس کا صاف جواب تھا: "عصا یعنی لاٹھی ہے۔" مگر حضرت موسیٰؑ نے اس پر قناعت نہ کی، بلکہ کہا: "یہ میرا عصا ہے، چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں۔ اسی سے اپنی بکریوں کے لئے درختوں کے پتے جھاڑ لیتا ہوں اور میرے لئے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ جواب اصل سوال سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ بالغ نظر عرفی نے اس سے یہ مضمون پیدا کر لیا کہ داستان پُر لطف اور شیریں تھی۔ اس لئے حضرت موسیٰؑ نے کلام کو زیادہ سے زیادہ طول دے دیا۔ یہی مثال سامنے رکھتے ہوئے کہا:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چنانکہ حرفِ عصا گفت موسیٰ اندر طور

عرفی کا شعر نہایت شگفتہ اور پُر لطف تھا، اقبال نے محض داستان کی لذت و شیرینی کو طولِ کلام کا موزوں عذر نہ سمجھا، بلکہ ایک نیا پہلو پیدا کیا، جو اتنا دلآویز ہے کہ سنتے ہی دل بے اختیار اس کی تصدیق پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

مولانا آزاد بنام غالب

مالک رام

اس سلسلے کی دو اور کڑیاں بھی ہیں۔ ایک وہ جہاں "آبِ حیات" میں غالب کے دوسروں کے ریشخند کو پی جانے پر کہا گیا ہے کہ وہ بہتے دریا تھے۔ دوسرے شہرتِ عام و بقائے دوام کے دربار میں بیان کیا گیا ہے کہ آخر میں غالب نے آ کر اس زور سے ناقوس پھونکا کہ کسی نے سمجھا، کسی نے نہ سمجھا، مگر کان سب کے گنگ ہو گئے، اور واہ واہ کرنے لگے۔ بلکہ کیا اس قسم کے ذومعنی فقرے صرف غالب تک محدود ہیں؟ آج سے بیس پچیس برس پہلے راقم الحروف نے "خاقانی ہند" میں "استاد ذوق" سے متعلق ایسے متعدد فقروں اور واقعوں کی نشان دہی کی تھی اور کچھ عجب نہیں کہ بعض دوسرے اشخاص کے بارے میں بھی ایسی مثالیں دستیاب ہوں۔ اس کے معنی ہیں آزاد بنام ذوق - آزاد بنام آزاد - آزاد بنام ... اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ آزاد بذلہ سنجی برائے بذلہ سنجی کے قائل تھے۔ وہ لطائف و ظرائف سے باز نہیں رہ سکتے تھے خواہ وہ انہیں کہیں بھی لے جائیں۔ بعض نے اس "لطیفہ بازی" کو ترہات بھی کہا ہے اور وہ خود اسے الفاظ کے طوطے مینا بنانا کہتے ہیں۔ (ر۔ خ)

یہ بات اب قاعدہ کلیہ کی طرح تسلیم کی جا چکی ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد ہمارے صاحبِ طرز ادیب اور انشا پرداز ہیں اور ان کا اسلوبِ تحریر بے حد دلکش اور دلفریب ہے، جس کا تتبع ممکن نہیں۔ یہ سب درست، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ قاری بالعموم اس کی زبان اور رچ چٹخارے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اس کی بعض دوسری خصوصیات کی طرف اس کا خیال جاتا ہی نہیں۔ آزاد کی نگارش کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تحریر بہت پہلو دار ہوتی ہے۔ وہ عام طور پر اعتراض یا نکتہ چینی صاف کھل کر نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی چوٹ سیدھی نہیں ہوتی، بلکہ وہ پہلو سے وار کرتے ہیں۔ پڑھنے والا ان کے فقروں کے دروبست اور انشا کی رنگینی میں ایسا گم ہو جاتا ہے کہ اسے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ انہوں نے کہاں چٹکی لے لی۔ آج کی صحبت میں ان کے غالب پر اعتراضوں کا جائزہ لینا مقصود ہے۔[1]

۱۔ مولانا آزاد کی نظر میں غالب دراصل اردو کے نہیں بلکہ فارسی کے شاعر ہیں۔ اسی لئے ان کا خیال ہے کہ ان کے نام کا آبِ حیات میں شمول بے محل ہے، جو اردو شعرا کا تذکرہ ہے۔ ہذا ان کا حال شروع ہی ان الفاظ سے کرتے ہیں:۔

"مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر کا تھا اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے، لیکن چونکہ تصانیف ان کی اردو میں چھپی ہیں اور جس طرح امراء و رؤسائے اکبر آباد میں علوِ خاندان سے نامی اور میرزائے فارسی ہیں، اسی طرح اردوئے معلیٰ کے مالک ہیں، اس سے واجب ہوا کہ ان کا ذکر اس تذکرہ میں ضرور کیا جائے"

(ص ۶۲۵)

یہاں مولانا آزاد دو باتوں پر توجہ دلانا چاہتے ہیں:۔

(الف) "ان کا اصلی شوق نظم و نثر فارسی کا تھا ... اور وہ میرزائے فارسی ہیں" گویا اردو سے تعلق محض ثانوی تھا۔

(ب) "امراء و رؤسائے اکبر آباد میں علوِ خاندان سے نامی ہیں"

امیر زادہ اور رئیس زادہ اور وہ بھی دلی کا نہیں بلکہ آگرے کا۔ مقصود یہ ہے کہ رئیس ہوں گے، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ شاعر بھی بڑے ہیں۔ جب کہ وہ زبان کے مرکز دلی میں پیدا بھی نہیں ہوئے، بلکہ آگرے میں۔

---

[1] میرے سامنے "آبِ حیات" کا وہ ایڈیشن ہے جو سرفراز پریس لکھنؤ میں چھپا اور جسے احسان بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔ بہت غلط چھپا ہے۔

(ج) شاید یہ بھی کہنا چاہتے ہوں کہ اگر عالی خاندان بھی ہیں، تو آگرے میں، یہاں دلی میں انہیں کون پوچھتا تھا۔ یاد رہے کہ آبِ حیات غالب کی وفات کے بعد شائع ہوا، اور غالب کی ساری عمر دلی میں گزری تھی۔

۲۔ ان کی فارسیت کو انہوں نے پھر دہرایا ہے، اور یہاں ایک اور ٹنگی لی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"اس میں کچھ شک نہیں کہ میرزا اہلِ ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ مگر علوم درسی کی تحصیل طالب علمانہ طور سے نہیں کی اور حق پوچھو تو یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ایک امیرزادہ کے سر سے بچپن میں بزرگوں کی تربیت کا ہاتھ اٹھ جائے اور وہ فقط طبعی ذوق سے اپنے تئیں اس درجۂ کمال تک پہنچائے" (ص ۶۳۰ - ۶۳۱)

یہاں پھر اسی پہلی بات کا اعادہ کیا ہے۔ لیکن "اہلِ ہند میں" کے تین لفظی اضافے سے یہ بتایا ہے کہ بے شک وہ "فارسی کے باکمال شاعر تھے" لیکن اہلِ ہند کی حد تک، اہلِ ایران کے مقابلے میں وہ کسی شمار قطار میں نہیں۔

لیکن ایک اور وار یہ کیا ہے کہ نہ ان کی تعلیم معروف اور منظم طریقے پر ہوئی، نہ انہیں بزرگوں کی نگرانی اور تربیت میسر آئی۔ اس لئے سب کچھ ناقص اور ادھورا رہ گیا۔ گویا جہاں تک ان کے "امیرزادہ" ہونے کا تعلق ہے، بجا و درست، لیکن تعلیم و تربیت کا خانہ خالی ہے۔ اور اس پہلو سے انہیں کوئی امتیاز حاصل نہیں۔

۳۔ دیوان اردو سے متعلق فرماتے ہیں:-

"تصنیفات اردو میں تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا ایک دیوان انتخابی ہے کہ ۱۸۴۹ء میں مرتب ہو کر چھپا۔ اس میں کچھ تمام اور کچھ ناتمام غزلیں ہیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ غزلوں کے تخمیناً ۱۵۰۰ شعر۔ قصیدوں کے ۱۶۳ شعر۔ مثنوی ۳۳ شعر۔ متفرقات قطعوں کے ۱۱ شعر و رباعیاں ۱۶۔ دو تاریخیں جن کے ۴ شعر۔ جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس سے ہزار درجہ عالمِ معنی میں کلام بلند ہے۔ بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے"

("آبحیات" ص ۵۱۴ - طابع، شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور، طبع دوازدہم لاہور)

آخری فقرے سے کہیں یہ دھوکا نہ ہو کہ مولانا، غالب کی بلند خیالی اور جدتِ مضامین کی مدح سرائی کر رہے ہیں۔ بلکہ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کلام (اور وہ بھی اکثر) ان کا بے معنی ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ وہی بات ہے۔ جو ان کے استاد حکیم آغا جان عیشؔ نے برسرِ مشاعرہ، غالب کو مخاطب کر کے اس قطعہ میں کہی تھی:-

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے، تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے، اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

۴۔ پھر کلام کے نقائص سے متعلق ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں:-

"اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے بیشہ کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں: اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انہیں طبعی تعلق تھا، اس لئے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے" (ص ۶۴۴)

یہاں کلام کے دو نقص گنوائے ہیں۔ پہلا تو وہی جو اوپر بیان ہوا کہ "ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے"۔ یہاں انہوں نے حاشیے میں عبداللہ خاں اوجؔ کے حالات درج فرمائے ہیں۔ اور ان سے گویا غالب کے کلام کی مثال پیش کی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:-

"اوجؔ تخلص، عبداللہ خاں نام۔ ۴۰، ۵۰ برس کے مشاق تھے۔ ایسے بلند مضمون اور نازک خیال پیدا کرتے تھے کہ قابو میں نہ لا سکتے تھے اور انہیں عمدہ الفاظ میں ایسی چستی اور درستی سے باندھتے تھے کہ وہ مضمون سما بھی نہیں سکتا تھا، اس لئے کبھی تو مطلب

کچھ کا کچھ ہو جاتا تھا اور کبھی کچھ بھی نہیں رہتا تھا۔" (ایضاً)

گویا جو بات وہ غالب کے لئے صراحت سے لکھنے کی جرأت نہیں کر سکے تھے اور اسے صرف "معنیٰ آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا" کہہ کے رہ گئے تھے، اس کی انہوں نے یہاں شرح کر دی۔

لیکن دوسرا اعتراض اس سے اہم تر ہے۔ جب وہ لکھتے ہیں کہ اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے ہیں کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں" تو اس سے مراد ان کی یہ ہے کہ وہ غلط زبان اور محاورے اور روزمرے کے خلاف اردو لکھتے ہیں۔ اس کی کچھ مثالیں انہوں نے آگے اردوئے معلیٰ کے خطوط سے متعلق لکھتے ہوئے دی ہیں۔

۵۔ یہاں تک تو نظم کا بیان تھا، اب ذرا نثر کا بھی سن لیجئے جس سے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ نئی اردو کا بانی، بلکہ موجد غالب ہے، اور "اردوئے معلیٰ" اس "دین" کی "ایزدی کتاب" ہے۔ اردوئے معلیٰ پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس مجموعہ کا نام مرزا نے خود اردوئے معلیٰ رکھا۔ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا آپ سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں۔ مگر کیا کریں کہ ان کی باتیں بھی خاص فارسی کی خوش نما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصع ہوتی تھیں۔ بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں، تو وہ جانیں، یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

- کیا جگر خون کن اتفاق ہے۔

- اب در رنگ دوزی کی تقصیر معاف کیجئے۔

- پس چاہیئے کوئل کی آلاش کا ترک کرنا اور خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا۔

- یہ رتبہ میری ارزش کے فوق ہے۔

- سرمایۂ نازشِ قلمرو ہندوستان ہو۔" (ص ۶۴۸)

یہ تو انہوں نے یونہی انکسار سے لکھ دیا کہ "بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں، تو وہ جانیں، یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے۔" دراصل یہاں پھر انہوں نے ہجو ملیح کی ہے اور یہ کہا ہے کہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں، یہ اردو نہیں بلکہ فارسی ہے اور اردو ان فارسی ترکیبوں اور تراشوں کی تحمل نہیں ہو سکتی، اور نہ کوئی انہیں سمجھتا ہی ہے۔"

۶۔ اسی سلسلے میں آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"بعض جگہ خاص محاورۂ فارسی کا ترجمہ کیا ہے، جیسے میر اور سودا وغیرہ کے کلام میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ انہی خطوں میں فرماتے ہیں: "اس قدر عذر چاہتے ہو" یہ لفظ ان کے قلم سے اس واسطے نکلا کہ "عذر خواستن" جو فارسی کا محاورہ ہے، وہ اس باکمال کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ ہندوستانی عذر کرنا یا عذر معذرت کرنی بولتے ہیں۔" نظر اس دستور پر، اگر دیکھو تو، مجھے اس شخص سے خس برابر علاقہ عزیز داری کا نہیں۔" یہ بھی ترجمہ "نظر بریں ضابطہ" کا ہے۔

"منشی نبی بخش تمہارے خط نہ لکھنے کا گلہ رکھتے ہیں۔" "گلہ ہا دارند"، "شکوہ ہا دارند" فارسی کا محاورہ ہے۔

"کیوں مہاراج، کول میں آنا منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنی، اور ہم کو یاد نہ لانا۔" "یاد آوردن" خاص ایران کا سکہ ہے، ہندوستانی یاد کرنا بولتے ہیں۔

"جو آپ پر معلوم ہے، وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔" "ہرچہ بر شما منکشف است، بر من مخفی نماند۔" (ایضاً)

یہاں انہوں نے صاف صاف نہ صرف یہ بتا دیا ہے کہ غالب کن فارسی محاوروں کا ترجمہ کر رہے ہیں، بلکہ ان کی اصلاح بھی کر دی کہ ٹھیک اردو محاورہ کیا ہے، جسے وہ اپنی اردو سے ناواقفیت کی بدولت استعمال نہ کر سکے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ فارسی محاوروں کا ترجمہ میر و سودا کے زمانے تک تو جائز تھا کہ زبان ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں تھی، اس میں الفاظ اور محاورات کا ذخیرہ ناکافی تھا، لیکن اب یہ عذر قابلِ قبول نہیں۔ اب ٹھیک روزمرے کے مطابق لکھنا چاہیئے۔

۷۔ خطوں کے طرزِ نگارش سے متعلق ارشاد ہوتا ہے:۔

"ان خطوں کی طرزِ عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں۔ یہ انہی کا ایجاد تھا کہ آپ مزا لے لیا اور اوروں کو لطف دے گئے، دوسرے کا کام نہیں۔ اگر کوئی چاہے کہ ایک تاریخی حال یا اخلاق

باقی ص ۶۰

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد

محمد عتیق صدیقی

غالب کے عزیز شاگرد، میر مہدی مجروح (۱۸۳۳ء/۱۹۰۵ء) کا ایک ترجیع بند غالب کی وفات کے پانچ ماہ اور پانچ دن بعد دہلی کے "اکمل الاخبار"[1] شمارہ ۲۹، جلد ۴، مورخہ ۲۰ جولائی ۱۸۶۹ء) میں شائع ہوا جو مجروح کے دیوان "مظہرِ معانی" (طبع دہلی ۱۸۹۹ء) میں بھی شامل ہے۔ ان دونوں میں بے حد فرق ہے۔ لفظی فرق و ترمیم سے قطع نظر، بعض جگہ بند کے بند بدلے ہوئے ہیں۔ اس ترجیع بند کو یہاں اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ دونوں کے تمام اشعار یکجا ہو جائیں اور جہاں جہاں فرق ہے اس کی نشان دہی کر دی جائے۔ مشترک اشعار ویسے ہی رہنے دئے گئے ہیں۔ لفظی اختلافات کی تشریح حاشیے میں بھی کی گئی ہے:

کیوں نہ ویران ہو دیارِ سخن — مر گیا آج شہریارِ سخن[2]
بلبلِ خوش ترانۂ معنی — گلِ رنگینِ شاخسارِ چمن
وہ نہالِ ثمر فشانِ کمال — وہ سہی سروِ جوئبارِ چمن — اکمل
اس کے رشحاتِ فیض سے سیراب — تشنہ کامانِ رہ گزارِ چمن — "
اس کے رخشِ خیال سے نبھتے — یکہ تازانِ کارزارِ سخن — "
ہائے وہ عیسوی نفس نہ رہا — کیوں فسردہ نہ ہو بہارِ سخن — "
ہائے اس کا وہ منتظم نہ رہا — کیوں نہ ابتر ہو کاروبارِ سخن — "
نخل بندِ حدیقۂ مضموں — تازگی بخش لالہ زارِ سخن — مظہر
عرصۂ نظم کیوں نہ ہو ویراں — بے عناں کش وہ شہسوارِ سخن — "
ساتھ ان کے گئی سخن سنجی — ان کا مرقد ہی ہے مزارِ سخن — "

آبیاری تھی جس سے وہ نہ رہا — اب خزاں ہو گئی بہارِ سخن — مظہر
نغمہ پیرائیاں کہاں وہ بہی — اب یہ ہے نالہ ہائے زارِ سخن — "

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

شہد گویا بھرا وہاں میں تھا — کیا مزا آپ کے بیاں میں تھا — "
وصف اس کا بیاں سے باہر ہے — لطف جو طبعِ نکتہ داں میں تھا — "
ہند میں رہ کے رشکِ ایراں ہو — وصفِ حضرت کی جو زباں میں تھا — "
ہم تو خدمت میں آپ کی خوش تھے — چرخ پر فکرِ امتحاں میں تھا — "
سر پہ سایہ یوں ہی رہے گا سدا — دلِ ناداں اسی دھیاں میں تھا — "
قدر انداز چرخ نے چھوڑا — جاں ستاں تیر جو کماں میں تھا — "
وہی گل چینِ مرگ نے توڑا — پھول یکتا جو گلستاں میں تھا — "
ان کی روزِ وفات دہلی میں — یہی مذکور دوستاں میں تھا — "

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد[1]

ایک جاں اور لاکھ کاہشِ غم — ایک دل اور لاکھ رنج و الم — "
کیوں کہ لب پر نہ آہ ہو ہر دم — ایک میں اور لاکھ درد و الم — اکمل
آتشِ غم کی ہے بھڑک ایسی — کام آئے نہ اپنے دیدۂ نم — "
فرطِ غم سے سیاہ ہے از بس — روز بھی ہو گیا شبِ ماتم — "
خوش دلی اب نہیں نصیبوں میں[2] — اپنے حرمانِ جاوداں کی قسم — "
جس پہ گذرے وہی یہ جانتا ہے — غمِ ہجراں ہے کس غضب کا ستم — مظہر
بد ہے دوری اگرچہ ہو دم بھر — زہر ہے زہر بیش ہو یا کم — "

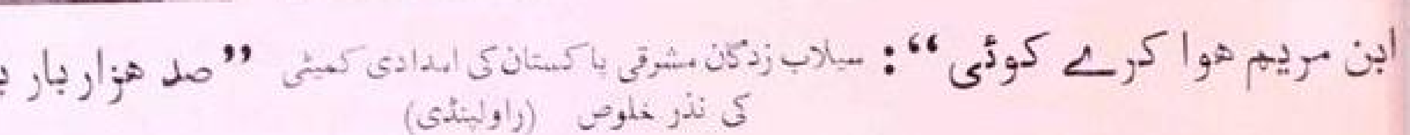
لہ یہ پورا بند "اکمل الاخبار" میں موجود نہیں۔

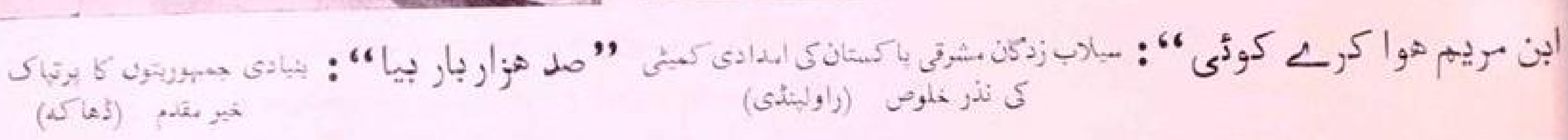
عہ "مظہرِ معانی" میں اس شعر کا پہلا مصرع بدلا ہوا ہے۔ اور پورا شعر یوں ہے:
روئے شادی کبھی نہ دیکھیں گے — اپنے حرمانِ جاوداں کی قسم

لہ اکمل الاخبار میں ترجیع بند کا عنوان ہے: "ترجیع بند متضمن تاریخ افکار شاعر شیریں مقال ناظم بے مثال میر مہدی مجروح، بہ صدائے نوحہ انگیز انتقال جناب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ، غالب، استادِ خود" اور "مظہرِ معانی" میں "ترجیع بند در وفات مرزا اسد اللہ خان صاحب مرحوم" ہے۔

ٹہ "مظہرِ معانی" میں دوسرا مصرع اس طرح ہے: "مر گیا آج تاجدارِ سخن"







"ابن مریم ہوا کرے کوئی": سیلاب زدگان مشرقی پاکستان کی امدادی کمیٹی کی نذر خلوص (راولپنڈی)

"صد ہزار بار بیا": بنیادی جمہوریتوں کا پرتپاک خیر مقدم (ڈھاکہ)



"لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو . . ." کھلنا اور راجشاہی ڈویژن میں بھی بنیادی جمہوریتوں کے اراکین و عمائد مشتاق نیاز

"باہمہ با ماجرا"

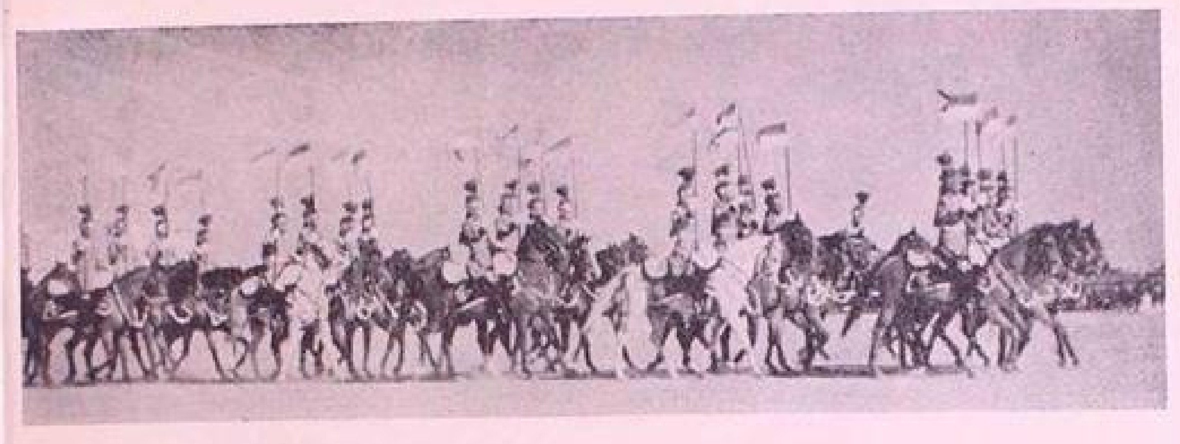


"سید والا نسب": سر سید (رح) کے زیر سایہ، جامعہ تعلیم ملی، ملیر، کے تصویر خانے میں

(دسویں سالانہ اجتماع کے موقع پر)



"زمیں تا آسماں": پاکستانی فضائیہ کے فلک پرواز شاہیں—اسٹار فائیٹر— روز بروز "منظر اک بلندی پر" کے جویا





"برملا برقص": "نشاط و طرب و زمزمہ عام است"۔ سپاہی اور شہری بے تکلف شیر و شکر۔ اس نشاط عام کے موقع پر ہم رزم ہم بزم خٹک ناچ کا ولولہ انگیز اور دلخوشکن مظاہرہ

"سلحشور": پشتینی جنگجو— وطن اور بیرون وطن ہر کہیں امن، دفاع اور خدمت خلق کے لئے سینہ سپر

"مرحبا اے نشاط خاص عوام"

(چوتھا یوم مسلح افواج)

ہر نیا سال اپنے ساتھ پاکستانی افواج کے
بری، بحری، ہوائی جانبازوں کو، جو قو
کے پاسباں بھی ہیں اور پشتیباں بھی
پاکستانی چہریوں سے روشناس کراتا او
ان کے دل میں اعتماد و دلجمعی کا حیا
افروز احساس پیدا کرتا ہے۔ اس لئے ک
ہماری افواج زور بازو، تنظیم، تربیت
سازوسامان، جدید ترین آلات۔ تمام امور می
انتہائی تیزرفتاری سے جادۂ ترقی پر گامزن ہی

'ہم جنگ جویان سنان در سنان'





"کنار بحر": شاندار جنگی جہاز "طغرل" جو اپنے ہمنام معرکہ آرا تاجدار و فاتح کی یاد دلاتا ہے۔



"خود ابلق ایام دریں دائرہ رام است": آئیے ہمارے فوج کے جانباز شعلۂ جوالہ میں سے بھی گزر جاتے ہیں

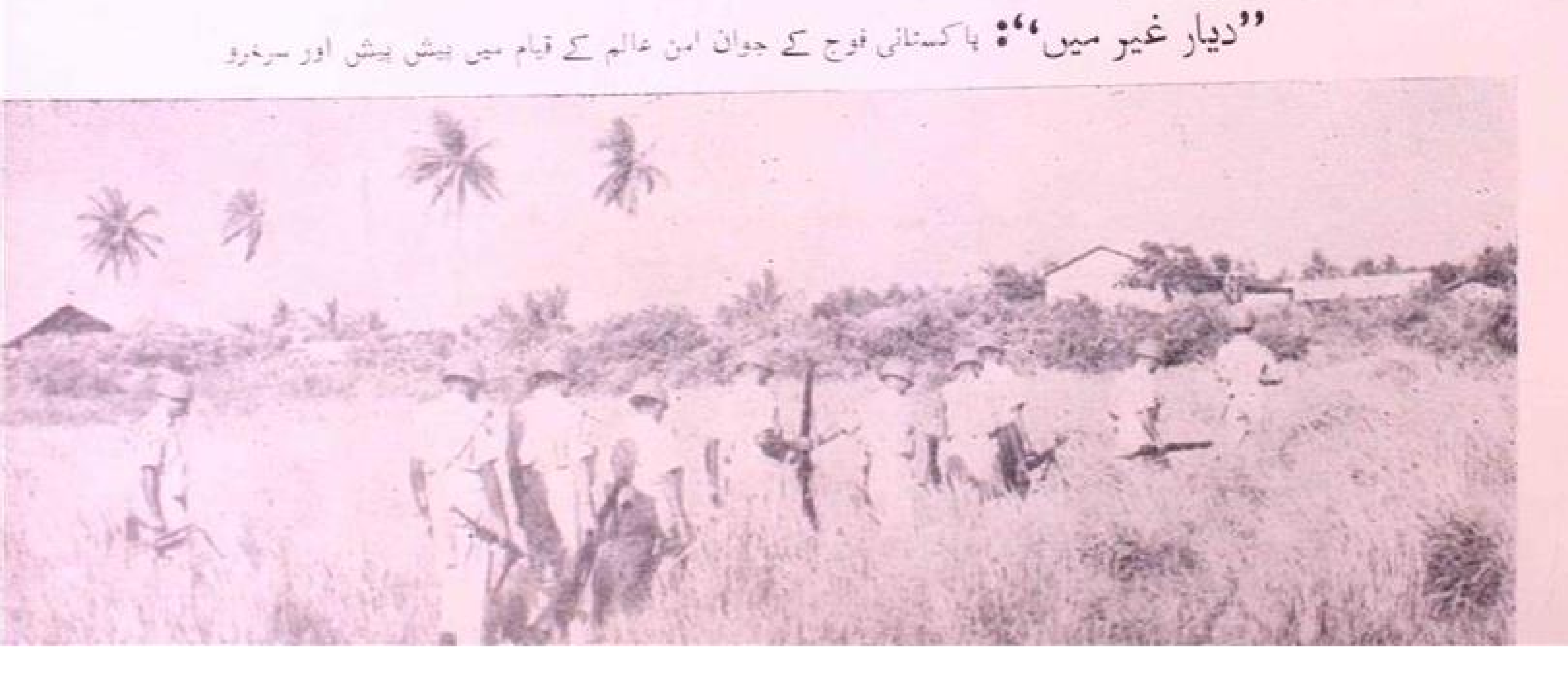


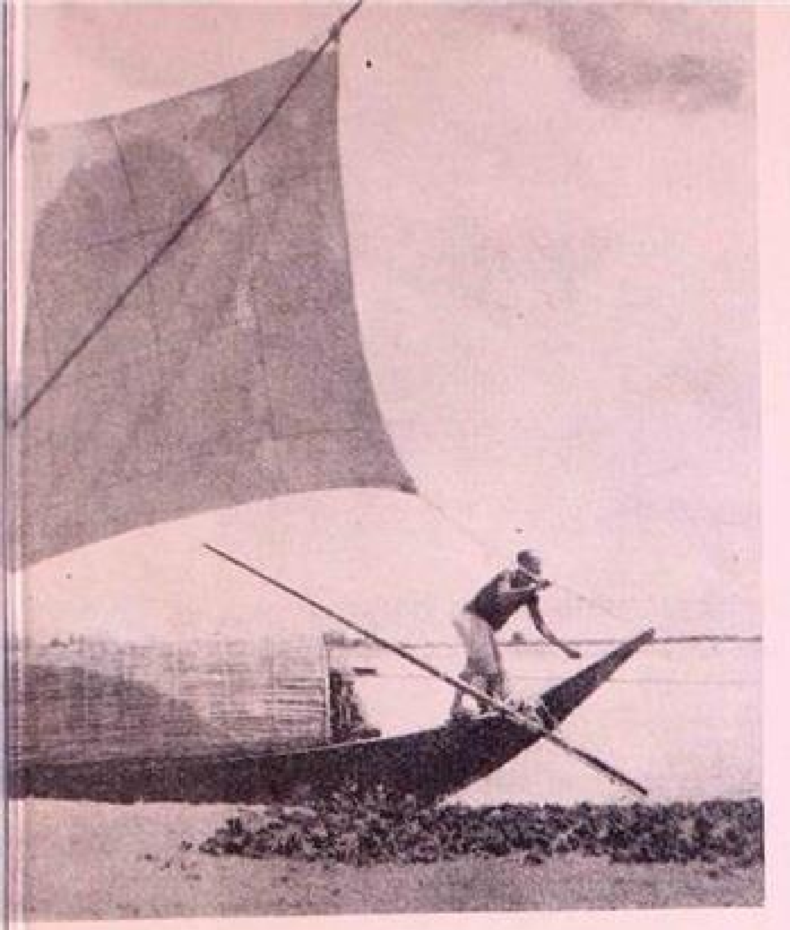
"ایں جاگسستہ اذ عنان شمارہ را": قطار اندر قطار دبابے ....

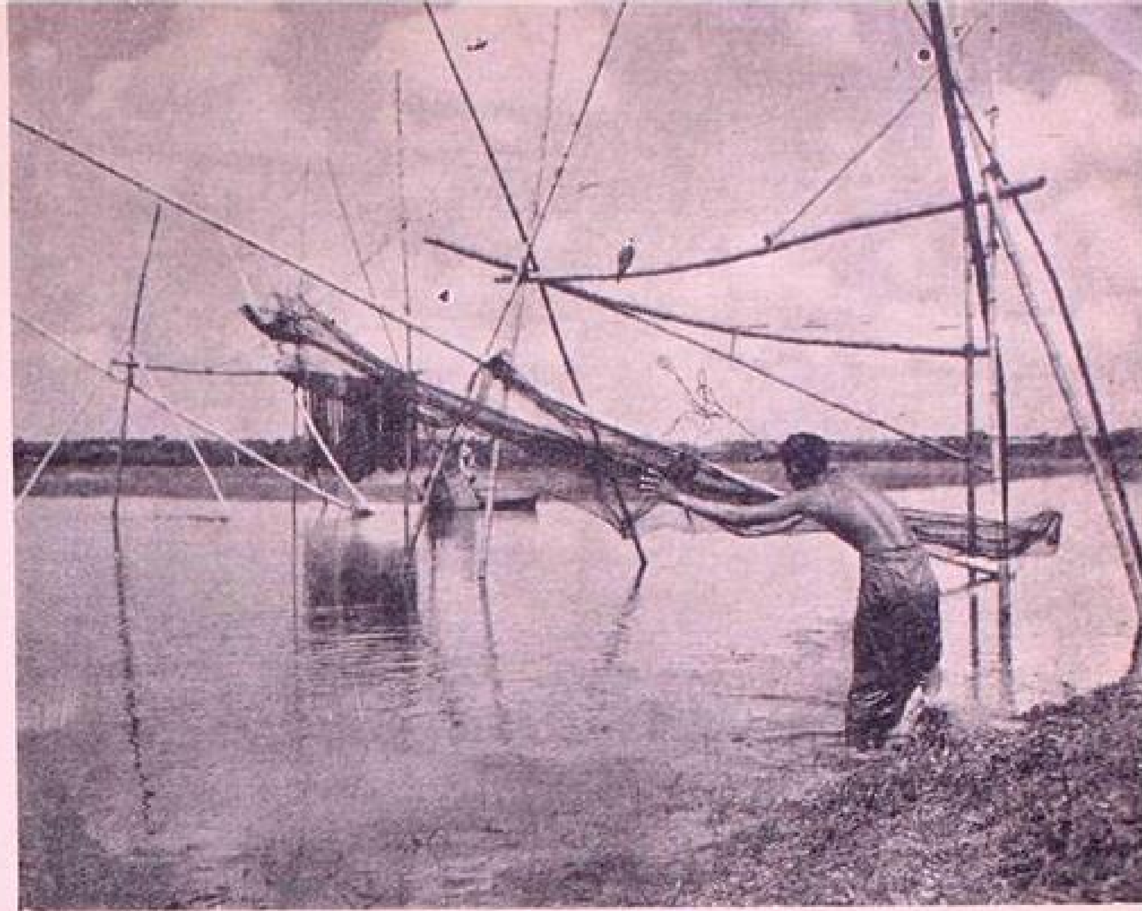


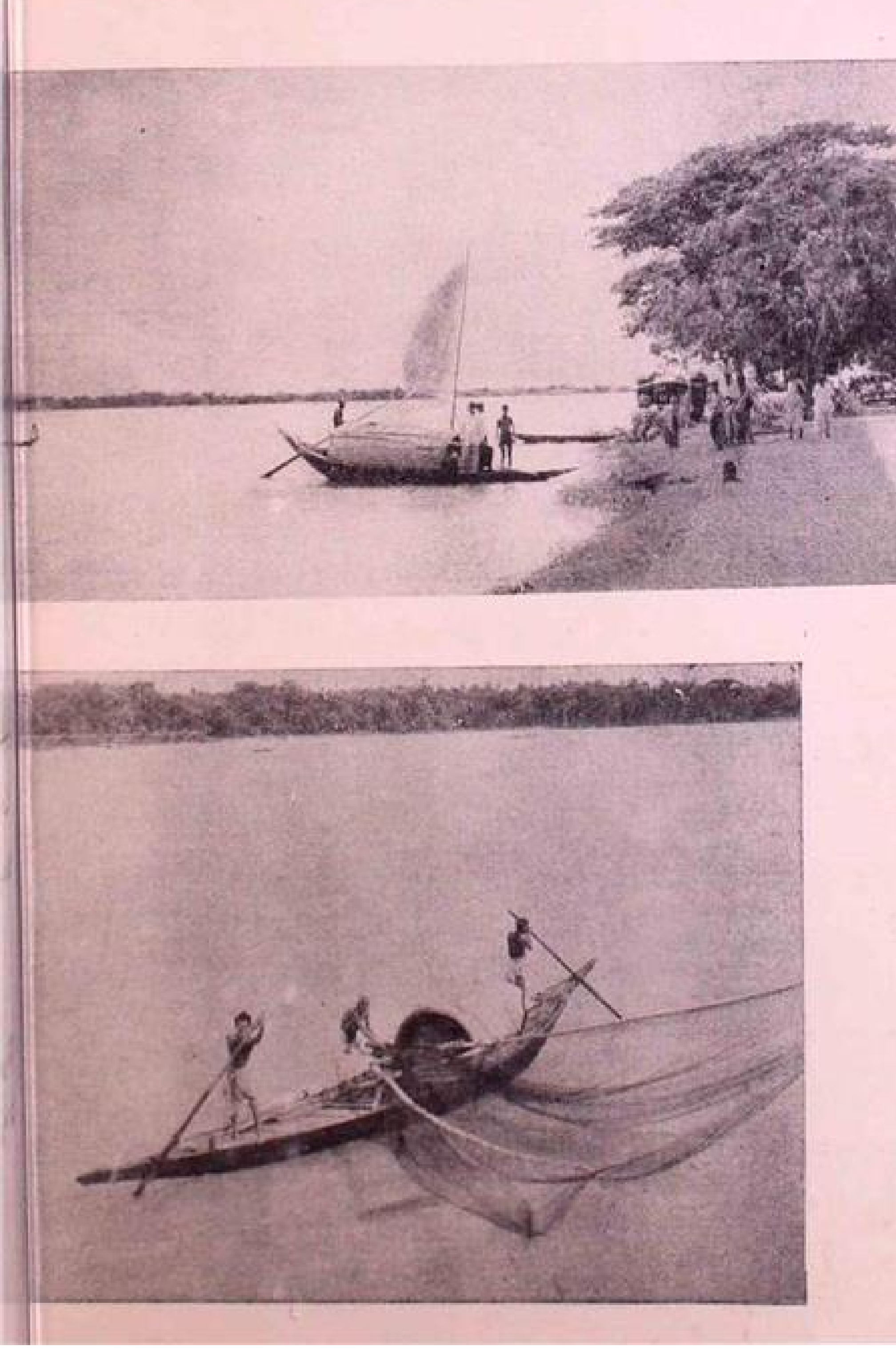
"رسائی تاکجا!" جر ثقیل کا عملی مظاہرہ

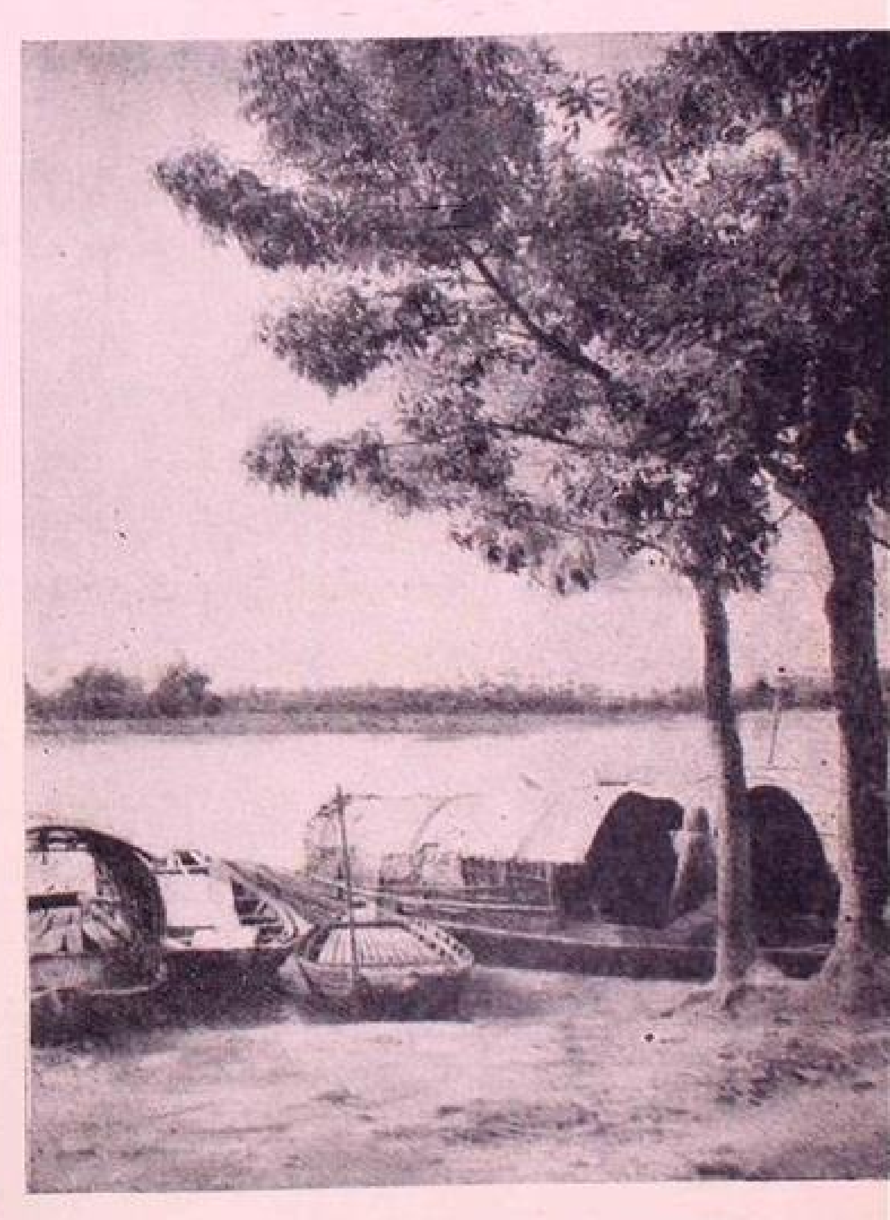
"دیار غیر میں": پاکستانی فوج کے جوان امن عالم کے قیام میں پیش پیش اور سرخرو











”بنگالہ فراموش مباد!“

ارض وطن کا وہ پر آب حصہ جو ہم سب کے لئے جنت نگاہ اور
جہاں کی زندگی تمام تر سفر در حضر اور حضر در سفر ہے

ہیں اس درد کا نہیں درماں — کہیں اس زخم کا نہیں مرہم
ہاں ذرا بڑھا ہو چشمِ طوفاں ریز — آنسو تو نے لگے ہیں کیوں کم کم[1]
مجھ سے پرساں ہے اس مصیبت کا — تجھ کو معلوم کیا نہیں ہمدم؟

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

تھے نظامی سے نظم میں ہم سر — فوق تھا نثر میں ظہوری پر مظہر
اس کا ثانی کوئی نہ اس کا نظیر — ایک سے ایک ہے غرض بہتر 〃
کون تسکین فزائے خاطر ہو — سخت بے چین ہے دلِ مضطر 〃
آتشِ غم کی ہے بھڑک ویسی — کام آئے نہ اپنے دیدۂ تر[2] 〃
اب تو دیدار کو دکھا دیجیے — میرے نالوں سے ہے بپا محشر 〃
جس کے دل میں ہو کاوشِ نشتر — اس کو آرام ہو بھلا کیوں کر اکمل
گھر کے دیوار و در تو ٹوٹ چکے — اب میں سر پھوڑنے کو جاؤں کدھر 〃
اُٹھ گیا آج وہ زمانے سے — تھا جو علم و کمال کا مظہر 〃
گر ہے موقوف حشر پر ملنا — تو فغاں سے ابھی ہوا محشر 〃
یار کرتے ہیں صبر کی تلقین — ظلم ہے جانِ ناشکیبا پر
آپ کے پاؤں تو نہ چلتے تھے — طے یہ راہِ دراز کی کیوں کر
کون سنتا ہے اب کسی کی بات[3] — آج کل تو یہ شور ہے گھر گھر

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

جب کہ آنکھوں سے وہ نہاں ہو جائے[4] — کیوں نہ دم سینے میں سناں ہو جائے
بلبلِ باغِ فضل ہے خاموش — چپ نہ کیوں مرغِ صبح خواں ہو جائے
یوں تو چپ بیٹھنا نہیں اچھا — دل پہ درد کچھ بیاں ہو جائے

---

[1] "مظہرِ معانی" کے دوسرے مصرع میں "کم کم" کی جگہ "تھم تھم" لکھا گیا ہے۔

[2] "اکمل الاخبار" میں یہ شعر تبدیلِ قافیہ کے ساتھ اس طرح ملتا ہے:

آتشِ غم کی ہے بھڑک ویسی
کام آئے نہ اپنے دیدۂ نم

[3] "اکمل الاخبار" میں اس شعر کا پہلا مصرع یوں ہے: "کوئی سنتا نہیں کسی کی بات"

[4] "اکمل الاخبار" میں یہ مطلع اس طرح لکھا گیا ہے:

جب کہ افزوں غمِ نہاں ہو جائے
کیوں نہ ہر دم دمِ سناں ہو جائے

مہرِ معنی ہے خاک میں پنہاں[1] — کیوں نہ تاریک سب جہاں ہو جائے
اس کے اندر ہے ایک رنگیں طبع — قبر کیوں کر نہ گلستاں ہو جائے اکمل
سر پہ ایک آ پڑا ہے کوہِ الم — کیوں نہ بے دم یہ ناتواں ہو جائے 〃
چونک اٹھیں خوابِ مرگ سے حضرت — اس قدر شور اے فغاں ہو جائے مظہر
جوش میں خونِ دل ہے اے غمِ دل — ریزشِ چشمِ خوں فشاں ہو جائے 〃
لب پہ رہتی ہے آہِ چرخ شکن — کہیں ٹکڑے نہ آسماں ہو جائے 〃
نالہ ہو یا کہ آہ یا گریہ — آج ان سب کا امتحاں ہو جائے 〃

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

صبر ہی ایک ہائے کیا نہ رہا — دل ہی صدمے سے خود بجا نہ رہا اکمل
کون عقدوں کو دل کے سلجھائے — وہ شفیقِ گرہ کشا نہ رہا
ان پہ تھا انحصارِ لطفِ سخن — اب کسی بات کا مزا نہ رہا
ان کا جینا تھا آرزو اپنی — اب کوئی دل میں مدعا نہ رہا
صبر و آرام ہوش کھو بیٹھے — کوئی بھی اپنا آشنا نہ رہا
اب تو یہ عرش سے ادھر پہنچی — شکوۂ آہِ نارسا نہ رہا
ہو گیا ترک مسلکِ معنی — ہائے اس رہ کا رہنما نہ رہا

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

سوزشِ غم سے پھنک چکا ہوں میں — اب ترا منتظرِ صبا ہوں میں اکمل
فرطِ غم سے یہ بے حواسی ہے — "کیا کہا" کہہ کے پوچھتا ہوں میں
بے بسر پیچ و تاب میں ہوتی — یار کا طرۂ دوتا ہوں میں
کوئی ہمدم مجھے نہیں پاتا — بن گیا اپنا مدعا ہوں میں
غمِ استاد ہے یہی کہتا — کچھ عجب دردِ بے دوا ہوں میں
سب احبا گئے بہ قولِ میر — میں رہا ہوں سو کیا رہا ہوں میں
کیوں نہ پھنس جاؤں للکۂ فرقت میں — کیوں نہ پابندِ صد بلا ہوں میں

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

---

[1] اکمل الاخبار میں اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح آیا ہے: "خاک میں ہے وہ مہرِ اوجِ سخن"
بند ۶، ۷، ۸ اور ۹ اکمل الاخبار میں موجود ہیں لیکن "مظہرِ معانی" میں ان کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح آخری پانچ بند — ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، "اکمل الاخبار" میں درج نہیں۔ یہ بند بعد میں لکھے گئے ہیں۔

بے قراری سی بے قراری ہے   اشکباری سی اشکباری ہے   اکمل
متزلزل زمین ہے اس سے   اس سے اک چشمۂ خوں جاری ہے
سخت جاں کوئی مجھ سا ہوئے گا   میں نے ہجراں کی شب گزاری ہے
جان بچتی نظر نہیں آتی   تیغِ فرقت کا زخم کاری ہے
اُن کی تصویر ہو بہو کھینچی   یہ تصور کی نغز کاری ہے
خاک میں وہ درِ شرف مل جائے   خاک اب زندگی ہماری ہے
دل پہ اک صدمۂ عظیم ہے آج   کیا یہ خالی فغان و زاری ہے

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

چھوڑتا کیوں کر ان کو چرخِ کہن   ہے یہ اہلِ کمال کا دشمن   اکمل
عرش پیما خیال تھا جس کا   اس کا اب خاک میں بنا مدفن
شعر کیا ہیں طلسمِ معنی ہیں   سحر تھی ان کی طبعِ جادو فن
نظم ہے سینہ چاک اس غم سے   بیت بھی ہو گئی ہے بیتِ حزن
طبعِ رنگیں کی دیکھنا تاثیر   رگِ گل بن گیا ہے تارِ کفن
ان کا سالِ وفات بھی مجروح   لکھ دیا "روضۂ جناں مسکن"
یاد کر نغمہ سنجیاں ان کی   یہی کہتے ہیں کر کے سب شیون

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

اہلِ دہلی کی تھی بری تقدیر   جو اٹھایاں سے ایسا با توقیر   مظہر
ایسے پھر صاحبِ کمال کہاں   ہے یہ فضل و ہنر کا دورِ اخیر
نظمِ اردو سے ٹپکی پڑتی ہے   وہ جو ہے طرزِ خاص حضرتِ میر
اور دیوانِ فارسی ان کا   فلکِ نظم کا ہے ماہِ منیر
غزلِ فارسی میں ہے جو شعر   ہے نظیری کی فکر کا وہ نظیر
ان کی دوری میں دیکھ لے مجھ کو   جس نے دیکھی نہ غم کی ہو تصویر
اضطراب مدام بد ہے مگر   دل پہ قابو نہ ہو تو کیا تدبیر
باغِ فضل و ہنر کو خالی دیکھ   نالہ زن یوں ہے بلبلِ دلگیر

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

ان کی شفقت جو یاد آتی ہے   چشم دریائے خوں بہاتی ہے   مظہر
کل نہ تھی جس جگہ کے بے چین   وہی جا اب تو کاٹے کھاتی ہے
یوں تو سنسان ہے مکاں سارا   آہ پر شور و غل مچاتی ہے
بے قراری کا زور مت پوچھو   صبر کی دھجیاں اڑاتی ہے
کون آتا ہے بہرِ پرسشِ حال   ہاں غشی غم سے آتی جاتی ہے
ان کی دوری میں ہے یہ بدمزگی   کہ نہیں زیست اپنی بھاتی ہے

یہ انہی کا مزار ہے شاید   یاں سے کچھ بوئے الفت آتی ہے
کان دھر کر جدھر سے سنتے ہیں   یہ ندا آ کے غم بڑھاتی ہے

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

کون دیتا ہے یاں کسی کی داد   تم گئے جاؤ نالہ و فریاد   مظہر
کیا شریفوں کی قدر ہو اس کو   آسماں جب کہ خود ہو سفلہ نہاد
اس کو ہے اپنی کج روی سے کام   کوئی برباد ہو کہ ہو آباد
کوئی استادِ فن مرے تو مرے   ہے یہ جور و ستم میں خود استاد
انتقالِ جناب غالب نے   کر دیا خانۂ ادب برباد
ہائے جنگل میں اس کی قبر بنی   کاخِ معنی کی جو کہ تھا بنیاد
اس کو خضرِ رہِ سخن سمجھو   ہے جو اُن کی زبان کا ارشاد
پوچھا یہ سانحہ جو یاروں نے   بولا مجروح با دلِ ناشاد

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد   اسد اللہ خانِ غالب مرد

تھی جوان کے مزاج میں تہذیب   وہ جہاں میں نہیں کسی کو نصیب   مظہر
ان سے دیکھا کبھی نہ فعلِ عبث   اس سے آگہ ہیں سب بعید و قریب
صلح کل کا رکھا تھا وہ برتاؤ   تھے وہ دشمن کی بھی نظر میں حبیب
تھی نہ اک بات لطف سے خالی   یہ بھی اک بات تھی عجیب و غریب
گفتگو میں عجب فصاحت تھی   ہوتے تھے جو جس کو سن کے ادیب
تھا ہر اک بات کا نیا انداز   ہر سخن کی تھی اک نئی ترکیب
خوش ہی جاتا تھا واں سے ہر غمگیں   تھے مگر آپ خوش دلی کے طبیب
ان کا تابوت دیکھ باحسرت   یہی کہتا تھا ہر امیر و غریب

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

ان سا پیدا کہاں ہو گر سو بار   کھائے چکر یہ چرخِ کج رفتار   مظہر
تھی یہ مضموں کی دُر دریزی (؟)   سلک گوہر تھی کلکِ جادو کار
ان کی رنگینیٔ عبارت سے   صفحہ کاغذ کا ہے یہ از گلزار
اُس کلامِ بلیغ کو دیکھو   لفظ اندک میں معنی بسیار
حلم طبعِ سلیم میں وہ تھا   چیونٹی کو تھا جس سے کچھ آزار
غسل دیتے ہیں آؤ مشتاقو   دیکھو حضرت کا آخری دیدار
گردِ تابوت تھا ہجومِ کثیر   اہلِ ماتم میں تھی یہی گفتار
جو کر جاتے تھے ہم رہِ تابوت   یہی کہتے تھے وہ پکار پکار

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد
اسد اللہ خان غالب مرد

غزل

غالب

(کم معروف کلام)

ہے گا جو ناز و ادا اس بُتِ لاثانی میں
ایک بھی بات نہ تھی یوسف کنعانی میں

عشق میں دیتا ہوں اس لیلیٰ کے کاوش جاں کو
دسترس ہے یہ کہاں قیس بیابانی میں

چرخ نے پنبۂ مہتاب کو کانوں میں دیا
شوریاں تک ہے مرے اشک کی طغیانی میں

جان مُردوں کی چھڑے لب سے جو نکلے دشنام
کیا مسیحائی ہے اوس لعل بدخشانی میں

کار شمشیر کا کرتا ہے خیالِ ابرو
داغ اس کا ہے ازل سے مری پیشانی میں

پہن کر ہووے گا خوش شال دوشالہ کوئی
ہم بھی ہیں شاد ہی غالب تن عریانی میں

★

یہ غزل صرف مجمع الاشعار میں طبع ہوئی۔ زبان قدیم ہے۔ غالب کا بالکل ابتدائی کلام ہے جس کو آٹھ نو سال کی عمر سے متعلق قرار دیا جا سکتا ہے اور اسی زبان میں ہے "پتنگ بازی" کے سلسلے کی مثنوی کی زبان اور اس کی زبان یکساں ہے۔ اس کا پہلا لفظ "ہے گا" اب متروک ہے مگر نواحی علاقوں میں اب بھی رائج ہے۔ مثنوی پتنگ بازی میں بھی یہ موجود ہے۔

ع ہیچ میاں ان کے نہ آنا زینہار
یہ نہیں ہیں گے کسو کے یار غار

اپنا احوال دلِ زار کہوں یا نہ کہوں؟
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں؟

نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں واقفِ اسرار کہوں یا نہ کہوں؟

شکوہ سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں؟

اپنے دل ہی سے میں احوال گرفتاریٔ دل
جب نہ پاؤں کوئی غمخوار کہوں یا نہ کہوں؟

دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمنِ جانی اپنا
ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں؟

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسد
حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں؟

★

غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خان معروف نے تضمین کی تھی۔ ان کے دیوان سے رسالہ معیار (مارچ ۲۳ء) میں شائع ہوئی پھر "علی گڑھ میگزین" (غالب نمبر) میں چھپی۔

کب رہا ہے اب ہمیں حور و بشر کا امتیاز
دیکھ کر جاتا رہا تجھ کو نظر کا امتیاز

اس کا کوچہ چھوڑ کر جاوے ہے گلشن کی طرف
ہو گیا معلوم بس بادِ سحر کا امتیاز

نازکی جس نے رگِ گل کی نہ دیکھی ہو کبھی
ہو میاں کیونکر اسے تیری کمر کا امتیاز

ہے یہ سودائے محبت ہی کہ یاں اس بات کو
کچھ نہیں رہتا یہاں نفع و ضرر کا امتیاز

جب نشست اغیار کے پہلو میں ٹھہری یار کی
تب ہمارا رہ گیا واں (؟) کدھر کا امتیاز

اہل ہمت پوچھتے (؟) ہیں خاک جب اکسیر کو
ان کو کب ہوتا ہے صرفِ سیم و زر کا امتیاز

آگے اپنے یار کے غالب ہمیں معیوب ہیں
ورنہ ہے کس کے، اسے عیب و ہنر کا امتیاز

★

چمن زار، چمن بے نظیر، مجمع الاشعار میں چھپی ہے۔ پھر "علی گڑھ میگزین" (غالب نمبر) میں شائع ہوئی۔

★

اشکِ خوں

غالب

مترجمہ احمد ریاض سجاد

حالی کا مرثیۂ غالب خلوص و احساس ہی نہیں، ہیئت میں بھی اپنی قسم کی پہلی چیز تصور کیا جاتا ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ خود غالب نے بھی اس وضع کا مرثیہ سید العلما امام حسین علیؓ کے واقعۂ شہادت پر لکھا تھا۔ اُن سے بھی پہلے نظیری نے ایسا ہی ترکیب بند اسی بحر میں حکیم ثنائی پر لکھا تھا۔ یہ بات عام طور معلوم نہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ اس سے پہلے بھی ایسے کئی مرثیے لکھے گئے ہوں۔ حالی نے جو مرثیہ لکھا تھا وہ بہ گمانِ غالب اس ہی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ گو اُن کے دلی احساس اور غالب کی ہر دل عزیزی نے اس میں کچھ اور ہی بات پیدا کر دی ہے۔ سوال تمام تر ادبی سلسلوں اور روایت کا ہے۔ اور اس ہی کی بنا پر، نیز اس کے موضوع کی بنا پر، ہم یہاں غالب کے نوشتہ مرثیے کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

یہ خرابی جو بے گراں آئی — خاک کیا چرخ کی بِنا ڈھائی
چشم و دل غرقِ خون باہم ہیں — رنگ کچھ ایسا کشمکش لائی
مارتا ہے بغیر تیر و سناں — غم کی یاروں پہ لطف فرمائی
شعلے لپکے بغیر، خاک سپہر — تھرتھرا اٹھا چرخِ مینائی
گر پڑا سدرہ سے ہمائے قدس — یوں نشیمن کی شاخ تھرائی
یہ قیامت اور ایسی بے ہنگام! — تھی حرم میں بھی گم دلِ آسائی
ابنِ مریم بھی سوئے خاک آئے — چھوڑ کر آسماں کی پہنائی
کعبہ زینے سے مردہ وار گرا — خبرِ مرگِ خواجہ جب پائی
غم سے خونِ دلِ کلیم بھی سرد — مہر بر لب تھی اس کی گویائی
آسماں گر زمیں پہ ٹوٹ پڑے — کیا قضا سے ہو جنگ پیرائی

ہائے یہ ماتمِ حسینؑ علی!
تازہ جس سے غمِ حسینؑ علی

اب زبانوں سے ہے پئے اظہار — خوں ٹپکنے لگا دمِ گفتار
ایک دنیا کے ظاہر و پنہاں — دل غم آمیز، آنکھیں دریا بار
دل میں افشردہ درد کے پاؤں — سیلِ اشک رواں ہے اور رخسار
میں نے پوچھا خرد سے اس کا سبب — بولی خاموش، پوچھ مت زنہار
تو نے دیکھا ہے اُن کی زیست کا رنگ — یاد کر اُن کے نیک خو اطوار
جب ہوئے وقفِ خواب باز نہیں — با دلِ شاد و دیدۂ بیدار

بزداللہ! گردِ روضۂ پاک — نقش ہی نقش بر در و دیوار
نہیں جلتا ہے تابِ شعلہ سے — بالِ پروانۂ چراغِ مزار
تھی نہ اُن کی وفات کچھ آساں — ایسے ہوتے ہیں زندہ دل دشوار

ماہ و تاریخ سید العلما
متوازی تھے با امام رضا

وہ امامِ بزرگ یزداں داں — قہرمانِ قلمروِ ایماں
گر نہ اُن کی زباں کرے توضیح — کون جانے گا معنیٔ قرآں
یہ فلک باہمہ توانائی — کیا ہے اِک گیند درخمِ چوگاں
جن کے آگے بہشت و دوزخ کو — چارہ کیا جز اطاعتِ فرماں
صفتِ ذات کیا بہ شرطِ وجوب — کہ سمائے بہ حیّزِ امکاں
ان کے جوہر کا ہے عرض اسلام — یہ نہ ہو تو اُسے قرار کہاں
وہ اولی الامر ثامن و ضامن — جس سے ہے وہ منجّی دوراں
حسبِ دعوت بہ خانۂ مامون — ہوا مہرِ سپہرِ دیں مہماں
اس ستم پیشہ کو یہ لازم تھا — کہ کرے خدمتِ امام بہ جاں
مگر اس نے زراہِ مکر و فریب — کیا لطف و مروّت و احساں
دیا اس کو دمِ ولیعہدی — جانتا تھا نہ پایۂ سلطاں

کم نظر وہ کہ در حمایتِ عہد
بادشہ کو بھی دے ولایتِ عہد

چند مامونوں کے آزمودہ غلام
اُن سے بولا کہ شب کے ہنگام

جائیں جلدی بنا کے پاؤں کو سر
سوئے درگاہ قبلہ گاہِ امام

گرچہ کتنی ہوں وہ بلندی پر
کھینچ لائیں بہ زیرِ سایۂ بام

اور یونہی بہ پائے بے آواز
جانبِ خواب گہ کریں اقدام

اہرمن فطرتانِ تیرہ دروں
خانہ زادِ سوادِ ظلمتِ شام

ڈھونڈتے ڈھونڈتے پہنچ ہی گئے
تا بہ ایوانِ شاہِ عرش مقام

تھے فروکش درونِ حجرۂ خاص
بسترے میں بہ رختِ خواب امام

او صبا کو ہے قربِ حق کے طفیل
جامۂ خواب جامۂ احرام

تیغیں برسیں تو اُن کے سر پہ مگر
جیسے اللہ سے درود و سلام

واپس آئے سبھی بہ ایں ایقان
کام ماہِ تمام کا ہے تمام

تن پہ اک بال بھی ہوا کب خم
پاک خوں سے ہوا نہ بسترِ نم

پیکرِ خواجہ کیا تھا چشمۂ نور
چشمِ بد مردمانِ حق سے دُور!

نور دیکھا ہے تیغ سے دو نیم
خون بہتے سنا ز آتشِ ہور[1]

سچ کہو، تھا وہ پیکرِ والا
درخورِ زخمِ خنجر و ساطور

گر نہ ہو تیرہ روز چمگادڑ
دن ہو کیوں اُس کی آنکھ سے مستور؟

پایۂ اہلِ بیت جانتے ہو؟
کہ ہے توأم بہ ایزدی منشور

کیا پیمبر کی یادگار نہیں
اہلِ بیت اور کلامِ ربِّ غفور؟

کب کرے نور اُس کا دل روشن
ہو نگہ جس کی ناشناسِ ظہور؟

شدتِ تپ میں موجِ نور کی کب
تاب لائے طبیعتِ رنجور؟

ہوئے اہلِ حسد مشاہدہ سے
دل ہمہ ریش کیا، ہمہ ناسور

تھا خلافت میں دشمنی کے سبب
بسکہ قتلِ امام عہدِ ضرور

آہ وہ میزبانِ مہماں کش
دے دیا سم بہ پردۂ انگور

زائروں کے لئے بہ مشہدِ طوس
آسماں آئے از پئے پابوس

قصۂ سینہ سوز و زہرہ گداز
کہہ دیا یوں بہ شیوۂ ایجاز

نازپروردۂ نیاز ہے عجز
میرا بہرِ گزارشِ اعجاز

میں کہاں اور التہاب ایسا
کہ کرے امتیازِ سوز و ساز

ہے شکایت عظیم گردوں سے
ہے مرے لب پہ داستانِ دراز

اُف! یہ آشوب، خوں رلاتا ہوا
ہائے غم! جس سے جاں کرے پرواز

مرگِ سید حسین سے رخصت
دل سے تاب اور لب سے ہے آواز

کس قدر تھا رجوع سوئے رسولؐ!
کس قدر تھا خدا سے راز و نیاز!

حیف! وہ حاملانِ عرش میں بھی
شور و شیون ز شہپرِ پرواز

پایۂ عرش چھوڑ کر آئے
کہ جنازہ میں ہوں شریکِ نماز

ہیں جہانِ مثال میں رکھتے
اس کو مہمانِ بزمِ نعمت و ناز

بہرِ احیائے رسمِ جہد و جہاد
خواجہ مہدی کے ہمسر و انباز

آفریں ان کی پاک جاں پہ سدا
مہر ہو ان کی خاک کا ذرہ

موجۂ خوں میں پھر شناور ہو
پھر شناسائے دیدۂ تر ہو

شمع سے کم نہیں تری ہستی
سیلِ آب، تابِ آذر ہو

جھونک دے خود کو تیز شعلوں میں
نہیں پروانہ تو سمندر ہو

لاغری سے دکھائی دے نہ سکے
تار از تارہائے بستر ہو

ہے گریباں تو چاک کر اس کو
ہے رگِ جاں اگر تو نشتر ہو

لب پہ ہو "واحسین" سرتاپا
شین و شیون ہو شورِ محشر ہو

پئے دیدہ ہو گرد و خار و خسک
پئے دل تیغ و تیرِ خنجر ہو

غمِ میرِ اجلؔ، غمِ دیں سے
شدتِ غم سے خاک بر سر ہو

خستہ و غمزدہ ہو۔ یہ مانا
اپنے سے کچھ ذرا فزوں تر ہو

ان کا طوفِ مزار اس کی طفیل
کیوں نہ افلاک کے برابر ہو

شعر اپنا ہے پھر خلش انگیز
کیوں نہ فریاد بھی مکرر ہو

ہائے یہ ماتمِ حسینؑ علی!
جس سے تازہ غمِ حسینؑ علی!

---

[1] سورج

شاہدِ ذات

غالب

مترجمہ: صدیق اکبر اعجاز

اے نہاں بخشِ آشکار نواز
غم سے دل، جاں سے تن گرامی ساز
جو شرر تجھ سے ہے بہ سینۂ سنگ
ہے رخِ لعل پر وہ جلوۂ رنگ
اے بساطِ زمیں نشیناں کو
اور مشامِ بیگانہ بیناں کو
نوبہاروں کی رگ سے نافہ کشا
دمِ بادِ سحر سے غالیہ سا
جس نے پھینکا بروئے شاہدِ ذات
عنبریں طرۂ نقابِ صفات
ہے بساطِ سیہ سے کیواں زا
تیرے جلووں سے وہ رفیع بنا
ہر فلک اک حبابِ قلزم ہے
اور زمیں لائے بادۂ خم ہے
تہِ خم سے تری یہ دیرِ مغاں
مے کی تلچھٹ بھی ہے سہیل افشاں
بوونی بخششِ خوب و زشت ہے تو
رونقِ کعبہ و کنشت ہے تو
بہتریں نقش ہیں کشیدہ ترے
این و آں سب ہیں آفریدہ ترے
آنکھ سے جوئے خوں تجھی سے رواں
نالہ کو بجلیوں کے پر ارزاں
دے دیا فرِّ خسروی مجھ کو
شانِ تجدیدِ فارسی مجھ کو
اپنی درماندگی سے ہوں خاموش
کہ تری مدح میں ہوں زمزمہ کوش
ناتوانی قوی اساسی ہے
خود نمائی خدا شناسی ہے

تراویح

(قطعہ نمبر ۲: فاتحہ)

غالب

ترجمہ: صدیق اکبر اعجاز

بہر ترویحِ جنابِ والیٔ یوم الحساب
ضامنِ تعمیرِ شارستانِ دلہائے خراب
بہر ترویحِ امامِ رہنمائے انس و جاں
عابدِ اللہ و معبودِ خلائق، بوتراب
دلدلِ برق آفریں کا رم بہ دنیائے خیال
جس طرح گزرے نگہ از حلقۂ چشمِ رکاب
بہر ترویحِ امام ابن امام ابن امام
آدمِ آلِ عبا، شاہنشہ عالی جناب
بہر ترویحِ محیطِ فیض باقرِ ذی شرف
جس کے شوقِ آستاں بوسی پہ اترائے ثواب
بہر ترویحِ علیؑ جعفرِ صادق کہ ہے
وارثِ علمِ رسول و خازنِ سرِّ کتاب
تکیہ جز بر قولِ اُو یکسر خطا، یکسر خطا
راہِ غیر از جادۂ او، ہے عذاب اندر عذاب
بہر ترویحِ شہ کاظمؑ کہ ہر عالم میں ہے
چوں قضا حکم اُن کا جاری چوں قدر رائے ثواب
بہر ترویحِ رضاؑ، تعمیرِ دنیا کے لئے
جادہ جن کا بہرِ معمارِ کرم یکسر طناب
بہر ترویحِ تقیؑ جن کی تماشاگاہ ہیں
طاقِ ایوانِ آسماں، مراتِ روشن آفتاب
بہر ترویحِ نقیؑ، وہ بہرِ تقریبِ نیاز
جن کی خاطر ہدیہ نرگس دان کا لایا ماہتاب
بہر ترویحِ حسنؑ وہ آفرینش کی پناہ
آستانہ جن کا رفعت سے حریفِ آفتاب
بعدہٗ بہرِ ظہورِ مہدیِ صاحب زماں
ظلمتستانِ شبِ کفر و حسد کا آفتاب
خاص کر کے بہرِ ترویحِ علمدارِ حسینؑ
پیشوائے لشکرِ شبیر و ابنِ بوتراب

آہنگِ غزل

عبداللہ خاور

حدیثِ کاکل و رخسار بارہا کہیئے
مگر، روایتِ پیشیں سے ماسوا کہیئے

کبھی جو تذکرۂ چشمِ سرمہ سا لکھیئے
نفس نفس کو جراحت سے آشنا کہیئے

"بطرزِ خاص" بیاں کیجے دل کے زخموں کا
کبھی جو "کاوشِ مژگاں" کا ماجرا کہیئے!

جمالِ معنیٔ رنگیں کو کیجیئے محسوس
پھر اس کے بعد ستم زائیٔ حنا کہیئے

خرامِ نازکو اک موجِ بوئے گل لکھیئے
یہ کیا ضرور، کہ پھولوں کو گردِ پا کہیئے!

وہ "جوئے خوں" تو کہاں۔ ایک اشک باقی ہے
اسی کو شمعِ سیہ خانۂ وفا کہیئے!

نہ بھولئے، کہ بہر حال ہے حسیں کوئی!
اب اس کو غیر سمجھئے، کہ آشنا کہیئے!

کہیں پہ پھول کھلیں، اور کہیں چراغ بجھیں
بہ صد کنایہ اسے شوخیٔ صبا کہیئے

رقیب و ناصح و اغیار، سب فرشتے ہیں
بس اک ہمیں کو "سزاوارِ مدعا" کہیئے

غزل جو لکھیئے، تو داغوں سے کھیلیئے پہلے
"وگرنہ" سوچیئے، کہیے جو "قافیہ"، کہیئے

متاعِ قدر و نظر، کوچۂ شعور میں ہے!
خرد کو، کوئے ملامت سے ماورا کہیئے

ہر ایک بت کو اگر دعویٔ خدائی ہو —
تو سر جھکانے سے پہلے ہی مدعا کہیئے!

جمالِ دوست کا ادراک برمحل کیجے
یہ کیا، کہ مونسِ جاں کو گریز پا کہیئے!

"ادا و غمزہ" سے بس گفتگو میں لیجے کام
کسی کو رہزنِ صبر و شکیب کیا کہیئے!

بتوں میں شیوۂ رم جب رہا نہ ہو باقی
یہ کیا ستم ہے کہ ہجراں کا ماجرا کہیئے

عجب مزا ہے لبِ سرخ و دستِ سیمیں میں
تو کیوں حکایتِ رنگینیٔ حنا کہیئے!

نہ اب "نوازشِ بے جا"، نہ "شیوۂ تمکیں"
کسی سے کیا ستم و جورِ "ناروا" کہیئے!

نہ اب "شکایتِ رنجِ گراں نشیں لکھیئے"
نہ "اب حکایتِ صبرِ گریز پا کہیئے"

نئے افق ہیں سرِ مطلعِ غزل خاور
نظر نہ آئیں، تو غالب نے جو کہا — کہیئے!

"بہ زینے کہ بر آہنگ غزل بنشینیم — خاک گلبوئے وہوا اشک فشاں می بائست" (غالب)

غالب کا رابطۂ فرنگ

سید قدرت نقوی

عظمت و برتری کا وجود دل و دماغ پر جو نقوش مرتسم کرتا ہے، زمانے کے انقلاب میں ان نقوش کو زائل کرنے کی طاقت نہیں۔ اس عظمت و برتری کے فقدان پر احساس برتری ہی شعور کمتری کا سبب ہوتا ہے۔ ان دونوں کے تصادم کا نتیجہ یا تو پستی کے قعرِ عمیق میں دھکیل کر ہمیشہ کے لئے عروج و ارتقا کے راستے مسدود کر دیتا ہے اور قویٰ کو قوتِ عمل سے بے بہرہ کر کے مفلوج بنا دیتا ہے، یا عظمت و عروج کا عرش نشیں ہونے کا شرف بخشتا اور قویٰ کو قوتِ عمل کا وہ جوہر عطا کرتا ہے کہ ناکامیوں اور نامرادیوں سے مایوسی کفر کے مترادف خیال ہونے لگتی ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ احساسِ برتری اور شعور کمتری کی آویزش، ہمت بلند کے لئے تازیانہ کا کام کرتی ہے کیونکہ احساس برتری اپنی بازیافت کا جذبہ ابھارتا ہے اور شعور کمتری اپنے استیصال کے لئے انگیخت کرتا ہے۔ اسی حصول و زوال کے مرحلہ کو طے کرنے کے لئے، بیش از بیش کوشش کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کبھی "حریف مئے مرد افگن" بن جاتا ہے اور کبھی روح القدس کو بھی اپنا ہمزباں نہیں سمجھتا، کبھی اس مقام پر، جہاں سے "کچھ ہماری خبر نہیں آتی" پہنچ جاتا ہے، اور کبھی "حلقۂ صد کام نہنگ" سے نبرد آزما ہوتا ہوا "گہر ہونے تک" کی منزل کو پا لیتا ہے۔

شعور کمتری کے شدید تاثر سے احساس برتری بھی شدت اختیار کر لیتا ہے، یہ شدت، یا تو عقل کو ماؤف کر دیتی ہے اور دماغ کو مختل بنا دیتی ہے، ایسی حالت میں جبکہ دماغی توازن برقرار نہ ہو، انسان توہم پرستی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس سے مافوق الفطرت ہستی ہونے کے دعاوی کا ظہور ہونے لگتا ہے، یا دوں ہمتی کے جوہر پیدا ہونے لگتے ہیں، جن کا نتیجہ گوشہ گیری کی منزل میں سکون بخشتا ہے۔ لیکن اگر اس شدتِ احساس میں عقل متوازن اور ہمت بلند ہو تو پھر انسان میں زمانہ سے نبٹنے کے عزائم جنم پانے لگتے ہیں اور ایسے مرد آزاد، غم و الم میں "برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم" کہتے نظر آتے ہیں، دنیا کو "بازیچۂ اطفال" اور تغیراتِ زمانہ کو "تماشائے شب و روز" سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک "اورنگِ سلیماں" صرف "ایک کھیل" اور "اعجاز مسیحا" بس "ایک بات" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

یہ باتیں، احساس برتری اور شعور کمتری کی آویزش اور اس دور کے تاریخی عوامل کے ردِعمل سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایسا انسان جو احساس برتری اور شعور کمتری کی آویزش کا شکار ہو اور اس میں زمانے کے تاریخی بہاؤ سے متصادم ہونے کی ہمت بلند بھی موجود ہو تو ان کے ردِعمل سے اس میں زہر خند کی کیفیت اس لئے پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے دور سے بہت آگے ہوتا ہے۔ اس عالم میں جو باتیں اس کی ذات سے ظہور پذیر ہوتی ہیں وہ اس دور کے عام مذاق و رجحان سے مختلف ہوتی ہیں، عام سطح سے بلند۔ اسی لئے وہ ہدفِ طنز و طعن بنتا ہے۔ معاصرین کا یہ طنز اس کی قوتِ تگ و تاز کو انگیخت کرتا ہے اور وہ اپنی طبع بلند کو زیر نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈال کر دیکھتا ہے اور خود کو منفرد بنانے کے لئے زمانہ کی نبض پر ہاتھ ڈالتا اور اقدار کا جائزہ لے کر اس مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اگر ایک اقتدار کی لگام میرے ہاتھ سے چھن رہی ہے تو اس کا نعم البدل تلاش کروں اور کوئی دوسرا اقتدار حاصل کر کے اس میں اپنی انفرادیت قائم کروں۔ اسی انفرادیت کو پا لینے کے بعد کہہ اٹھتا ہے:-

راز داں خوئے دہرم کردہ اند
خندہ بر دانا و ناداں می زنم

جو انسان احساس برتری و شعور کمتری کے تصادم کا شکار اور تاریخی عوامل کے ردِعمل کا اسیر ہو، اگر وہ بلند حوصلہ اور عالی ہمت ہو تو اس کی زندگی کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک وہ عالم کہ جس میں وہ اپنے احساسات، شعور و وجدان، کیفیات و جذبات، خواہشات و تصورات کی خوش آیند دنیا بناتا ہے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے اسباب فراہم کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ دوسرا وہ کہ جس میں وہ تاریخی بہاؤ سے متصادم رہتے ہوئے، عملی زندگی "خوش و ناخوش" گزارتا رہتا ہے۔ یہ عملی زندگی، درد و تکلیف کا مجموعہ ہوتی ہے، کیونکہ پہلے عالم کی وجہ سے جو "انا" اس میں جنم

لیتی اور پرورش پاتی ہے وہ اس کو بلند سطح سے نیچے آکر دریوزہ گری، تملق اور چاپلوسی کی سرحد میں داخل نہیں ہونے دیتی۔ مگر جب اس کے بہی خواہ اس کی عملی زندگی کی کربناکی سے متاثر ہوتے ہوئے اس کو مشورہ دیتے ہیں کہ اپنے زمانہ کی موجودہ روش کو دیکھو، جو تم سے کم مرتبہ ہیں مگر دادِ عیش دے رہے ہیں کیونکہ انہوں نے زمانہ سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ تم بھی "گر زمانہ با تو نسازد تو بزمانہ بساز" پر عمل کرو۔ پس ہر وقت کے اس مشورہ سے اس کے احساس برتری اور شعور کمتری کی کشاکش زیادہ تیز ہوتی ہے، اور وہ کبھی کبھی چند لمحات کے لئے رک کر زمانہ سے عارضی صلح کر لیتا ہے، اور ان مشوروں پر عمل پیرا ہو جاتا ہے جو اپنی سطح سے نیچے اترتا ہے۔ عرش سے فرش کی راہ لیتا ہے۔ "فقیروں کا بھیس بنا کر" وہ "تماشائے اہلِ کرم" دیکھنے لگتا ہے۔ مگر اس دریوزہ گری میں اس کا احساس اور زیادہ مجروح ہوتا ہے۔ وہ "انا" جس کو اس نے تھوڑی دیر کے لئے الگ کر دیا تھا اس کے اندر پھر ابھر آتی ہے اور "الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا" کی منزل پر لا کھڑا کرتی ہے۔ وہ دوسروں کا بن نہیں پاتا، بلکہ خود اپنا بن جاتا ہے اور اپنے کرم فرماؤں سے کہہ دیتا ہے "دیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے!"۔

احساس و شعور کی آویزش، اور قوتِ انا کے تاریخی بہاؤ سے تصادم کے نتائج کا عکس ہمیں غالب کی زندگی میں بہ تمام و کمال نظر آتا ہے اور ہم اسی آویزش، کشمکش اور تصادم کے چند پہلو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالب کے انگریزوں سے روابط کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ مگر ان روابط کو اب تک جن زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے، ان میں ان روابط کے عوامل، اس زمانہ کی سیاست اور اقدارِ حیات، کو پیشِ نظر نہ رکھنے کی کمی پائی جاتی ہے۔ غالب کے ذہنی رجحانات، خاندانی مراتب عظمت کو بھی انفرادی حیثیت سے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

غالب نے جب ہوش سنبھالا، باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ چچا نے سرپرستی فرمائی۔ غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار تھے، آگرہ کو انہوں نے انگریزوں کے حوالہ کر دیا اور نواب احمد بخش خاں کی سفارش پر انگریزی فوج میں رسالہ دار ہو گئے۔ ہزار روپے ماہانہ اور بقول بعض ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ اور ایک جاگیر رسالہ کے خرچ کے لئے مقرر ہو گئی۔ مگر غالب نو برس ہی کے تھے کہ چچا ہاتھی سے گر کر دارالبقا کو سدھارے۔ انگریزوں نے صلۂ خدمات و جاگیر کے عوض دس ہزار روپے سالانہ غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے متوسلین کی پنشن ریاست فیروز پور جھرکہ سے وابستہ کر دی۔ نواب احمد بخش خاں والیٔ ریاست تھے بقول غالب انہوں نے کچھ دن بعد دس ہزار کے پانچ ہزار سالانہ کرا دئے اور خواجہ حاجی کو بھی اس میں دو ہزار کا شریک کرا دیا جس سے غالب اور ان کے بھائی کو صرف پندرہ سو روپے ماہوار ملنے لگے۔ نواب احمد بخش خاں خانہ نشین ہوئے۔ ریاست دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی۔ فیروز پور جھرکہ شمس الدین کو ملا اور لوہارو امین الدین خاں کو۔ شمس الدین خاں کی خاندان کے دیگر افراد سے بنتی نہ تھی۔ شمس الدین نے غالب کی پنشن اور بیگم غالب کا وظیفہ بھی بند کر دیا۔ آمدنی کے وسائل مسدود، اخراجات کی تنگی نے پریشان کر دیا۔ غالب پہلے تو نواب احمد بخش خاں کے پاس گئے کہ ان سے مل کر معاملہ کو سلجھائیں، لیکن نواب صاحب نے باتوں سے بہلا دیا۔ غالب نے مجبور ہو کر قانونی چارہ جوئی کا ارادہ کیا۔

اس زمانہ تک غالب کی زندگی بہر طور فراغت میں بسر ہوئی۔ ننھیال سے والدہ کی معرفت کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ نواب احمد بخش خاں بھی کچھ نہ کچھ پنشن کے علاوہ دیتے رہتے تھے۔ سسرال سے بھی مدد ملتی رہتی تھی۔ بے فکری سے اس لئے بسر ہوتی تھی کہ خرچ کا بار برداشت کرنے والے تھے۔ نواب کہلاتے تھے۔ انہی ایام کے متعلق ایک خط میں اشارہ کیا ہے۔

"بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں، ادھر متھرا داس سے قرض لیا، ادھر درباری مل کو جا مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مول، نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بھوپھی کے سر، بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے آگرہ سے کچھ بھیج دیا۔"[1]

۱۸۲۵ء کے بعد ان امور میں تغیر واقع ہوا۔ قرض خواہوں نے تنگ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر خان (نواب احمد بخش خاں) کے رویہ میں تبدیلی ظاہر ہے۔ خاص کر ان کے بیٹے شمس الدین خاں نے غالب کو تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔

جس عہد کی ہم بات کر رہے ہیں وہ بڑی ابتری کا دور تھا۔ اگرچہ انگریزوں نے حالات کو کچھ نہ کچھ بہتر بنا دیا تھا مگر اہلِ ہند، معاشی و اقتصادی حیثیت سے بہت پریشان حال تھے۔ غالب نواب تھے، مگر جاگیر نہ تھی جائداد نہ تھی انتہا یہ کہ گھر کا مکان تک نہ تھا۔ اٹھنا بیٹھنا، امیروں، جاگیرداروں

---

[1] خطوط غالب ص [illegible]

اور رئیسوں کے ساتھ، وضعداری کو قائم رکھنا، عزت کو بنائے رکھنا بھی ایک ہمت وجوانمردی کا کام ہے۔ پس اسی وضع وعزت کی خاطر انہوں نے پنشن کی بحالی کے لئے کوشش کی، جو دراصل دس ہزار روپے سالانہ تھی جس میں غالب کا حصہ ڈھائی ہزار روپے سالانہ تھا اور وہ اس میں ہی بہر طور زندگی بسر کر سکتے تھے۔ پس پنشن کے نہ ملنے کی وجہ سے غالب دادخواہی کے لئے دہلی چھوڑ کلکتہ چلے، انگریزوں سے ملے، اپنی مطلب برآری کے لئے شاعری کو وسیلہ بنایا۔ گو غالب کے انگریزوں سے روابط پنشن کی بدولت بچپن سے رہے، لیکن وہ بالواسطہ تھے۔ یعنی پنشن نواب احمد بخش خاں کے توسل سے مل جاتی تھی۔ مگر جب پنشن میں رکاوٹ ہوئی اور خرچ میں تنگدستی بڑھی تو شعوری طور پر پنشن کی حقیقت پر توجہ دینی پڑی۔ کاغذات دیکھے تو غالب معلوم ہوا کہ پنشن میں رکاوٹ تو ظلم ہے ہی، تخفیف بہت بڑی ناانصافی اور جعلسازی ہے۔ انہی کے ازالہ کے لئے غالب کو انگریزوں سے بلاواسطہ روابط کا سلسلہ قائم کرنا پڑا۔

غالب کو اپنی خاندانی عظمت وبرتری کا بڑا احساس تھا۔ مگر تنگدستی کی وجہ سے گردوپیش میں شعور کمتری پیدا ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے تصادم نے انہیں پنشن کی طرف متوجہ کیا، جو خاندانی عظمت اور ذاتی معیشت کا واحد ذریعہ تھی۔ یہ ۱۸۲۰ء کی بات ہے اور اسی زمانہ سے انگریزوں سے روابط کا سلسلہ بھی شروع ہوتا ہے۔ کلکتہ انگریزی دارالحکومت تھا لہٰذا غالب پنشن کا دعویٰ کرنے کلکتہ روانہ ہو گئے۔ بقول مولانا مہر، غالب اپریل ۱۸۲۷ء کو دہلی سے روانہ ہوئے اور ۲۰ رفروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے[1]۔ وہاں انگریز حکام سے ملے اور پنشن کے معاملہ میں گفتگو کی۔ ان کے احباب و ہمدرد نواب اکبر علی خاں صاحب طباطبائی، مولوی سراج الدین صاحب اور منشی محمد حسن صاحب سرفہرست ہیں۔ انہی حضرات کے توسل سے اعلیٰ حکام تک بغیر زحمت رسائی حاصل ہوئی۔ سب سے پہلے ان کی ملاقات فریزر اسسٹنٹ سکریٹری سے ہوئی جس نے آمد پر استقبال کیا، گلے ملا، عطر و پان سے تواضع کی، رخصت کرنے ساتھ آیا۔ اسی کو گورنر جنرل کے نام کی درخواست دی، اس نے درخواست لیکر سٹر پاٹن کو دی کہ اس کو انگریزی میں ترجمہ کر دو[2]۔

اس کی مدح میں قصیدہ ۳۵ مشمولہ کلیات ہے۔ اس میں تشبیب نہیں ہے۔ مطلع کے بعد ہی مدح شروع کر دی ہے، مدح میں پارینہ و مروجہ طریقے سے کام لیا ہے۔ وہی الفاظ جو ہر ایک کی مدح میں اکثر شعرا استعمال کرتے رہے ہیں۔ گو بندش کی چستی اور روانی بلاشبہ رشک انگیز ہے۔ آخر میں اپنا دردِ دل بیان کیا ہے، ؎

غمے در دلست کہ شور بیانش
جگر پارہ از دیدۂ تر بر آرد
فشار دچہ اندیشہ ام مغز جاں را
ہمہ ریزۂ نوک نشتر بر آرد

مسٹر اندر و اسٹرلنگ، چیف سکریٹری سے ملے۔ اس کو سخن دوست پایا، اس نے امداد کا وعدہ کیا تھا، اس کی مدح میں قصیدہ ۳۹ اور قطعہ ۴۵ کلیات میں موجود ہے۔ قصیدہ اس کو سنایا، بہت خوش ہوا۔ اس قصیدہ کی تشبیب غالب کے دلِ غمزدہ کی ایک فغاں ہے۔ فغاں کے بعد اپنی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے مدح کی طرف گریز کرتے ہیں، مدح کا وہی عام طریقہ ہے۔ پھر اپنی حالت بیان کی ہے اسی میں مدعا پیش کیا ہے، گویا یہ منظوم عرضی ہے جس کے ذریعہ اسٹرلنگ کو اپنی مدد پر آمادہ کیا ہے، ؎

زبست سال فزوں میشود کہ می سوزد
نفس چو رشتۂ شمعم بہ بزم حیرانی
بداد گاہ رسیدم چنانکہ دانستم
برس بداد غریباں چنانکہ میدانی

غالب کا مقدمہ کونسل میں پیش ہوا تو اس پر حکم ہوا کہ اس کو پہلے دہلی کے ریزیڈنٹ کے سامنے پیش ہونا چاہئے۔ اس کے بعد یہاں آنا چاہئے۔ غالب نے کلکتہ ہی سے کاغذات مرتب کر کے دہلی بھیجے، ہیرالال کو وکیل بنایا۔ اس زمانہ میں دہلی کے ریزیڈنٹ مسٹر کولبرگ تھے، جن سے کرنل ہنری املاک کے گہرے مراسم تھے۔ کرنل ہنری املاک نے مسٹر کولبرگ کے نام اور مولوی سراج الدین نے میر منشی التفات حسین کے نام سفارشی خط دیا تھا۔ غالب کو قوی امید تھی کہ کولبرگ حسب منشا رپورٹ کرے گا۔ مگر کاغذات دہلی پہنچے تو کولبرگ بالزام رشوت ستانی برطرف ہو گیا، فرانس ہاکنس اس کی جگہ ریزیڈنٹ دہلی مقرر ہوا۔ ادھر گورنر جنرل نے کلکتہ سے الہ آباد اور دہلی کی طرف جانے کا پروگرام بنایا۔ غالب نے کلکتہ میں قیام کرنے کو

[1] غالب از مہر ص۱۰۰۔ غالب نے تاریخ ورود کلکتہ مولوی محمد علی خاں کو چہارم شعبان روز سہ شنبہ لکھی ہے۔ مولانا مہر نے تقویم کے ذریعہ عیسوی تاریخ سے تطابق فرمایا تو ۲۱ رفروری ۱۸۲۸ء روز چہار شنبہ لکھا۔ غالب نے تاریخ بقید یوم لکھی ہے جو بحساب رویت ہلال ہے۔ اس لئے جب ہجری تاریخ کو عیسوی سے مطابق کرتے ہیں تو دن کو اساس قرار دیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں تقویم ہجری تاریخوں کے لئے زیادہ مستند نہیں ہے۔

[2] کلیات نثر ص۱۶۰

مفید نہ سمجھا اور دہلی آنا اس لیئے مناسب خیال کیا کہ دہلی پہنچ کر خاطر خواہ رپورٹ لکھائی جائے۔ دہلی پہنچے، رپورٹ لکھوانے کی کوشش کی، مگر بیکار، کیونکہ شمس الدین نے فرانس ہاکنس کو اپنے موافق بنالیا تھا۔ چنانچہ اس نے غالب کے خلاف رپورٹ کردی۔ غالب کو پھر بھی امید تھی کہ اسٹرلنگ کام کو سنبھال لے گا۔ مگر ابھی رپورٹ نہ پہنچی تھی کہ مسٹر اسٹرلنگ کا انتقال ہوگیا۔ قطعہ[۱۵] اسی کی وفات پر لکھا ہے۔ اب ان کی امید صرف مسٹر جارج سوئنٹن سے وابستہ رہ گئی تھی، وہ بھی لندن چلا گیا۔ غالب بے یار و مددگار رہ گئے۔

مولوی سراج الدین احمد کو ۱۲ اکتوبر ۱۸۳۰ء ۵ جمادی الاول ۱۲۴۶ھ کو لکھتے ہیں:-

"اما چہ کنم کہ کار برگشت و روزگار برگشت، خدا را بنگر، و بدرد دل من وارس، کولبرگ بتوسط کرنیل ہنری املاک بر من مہربان شود و رپوٹیکہ خوشتر ازاں نتواں اندیشید بصدر فرستد، و جائیکہ سودمندتر ازاں نتواں سنجید از صدر حاصل نماید۔ ہنوز آں جواب در راہ باشد کہ کولبرگ معزول گردد، ہاکنس بجائے کولبرگ نشیند، انچہ برہم زدن ہنگامۂ سلطنتی را بس باشد از بہر من بصدر نویسد و من دراں داوری از مسٹر اسٹرلنگ چشم یاوری داشتہ باشم ہنوز آں رپورٹ بصدر نرسیدہ باشد کہ مسٹر اسٹرلنگ رہرو راہِ عدم گردیدہ باشد چوں ہمہ بگسلم و بہ من جارج سوئنٹن آویزم، اگرم از جا برخیزد و دامن برشغل جہانبانی افشاند۔ سبحان اللہ معزول نگردد مگر کولبرگ، بمرگ ناگاہ نمیرد مگر اسٹرلنگ، بولایت نرفت مگر جارج سوئنٹن، درخور ایں صدمہ ہائے جانکاہ نباشد مگر اسد اللہ دادخواہ"[۱]

ایک اردو خط بنام مسٹر وریار رہرڈی میں حضرت صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا، اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں، دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے، انہوں نے نہ دئے مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی اور استرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ رزیڈنٹ معزول ہوگئے، سکرتر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مرگئے"[۲]

فرانس ہاکنس نے غالب کے خلاف رپورٹ کی تھی۔ اس کی مذمت میں یہ قطعہ[۱۵] لکھا ہے:

ایا ستم زدہ غالب زہاکنس مگال
منہ بسینۂ بے کینہ از شکایت داغ
اگر بصدر خلاف تو کردہ است رپوٹ
وگر بخصم بقتل تو بستہ است جناغ
قضا بنائے خرابی فگندہ ہم زنخست
ندیدۂ کہ ہماں عکس غالبست بلاغ

انگریز مشرقی ہندوستان سے آگے بڑھ کر ہندوستان کے ہر علاقے پر بالواسطہ یا بلاواسطہ قابض ہو چکے تھے۔ بہادر شاہ ظفر بھی انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے۔ ان کا اقتدار صرف قلعہ کی چار دیواری تک محدود تھا۔ باقی ہر امر میں مختار کل انگریز تھے۔ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر بجز معدودے چند (اہلِ خانقاہ) ہر شخص ان کی طرف جھک رہا تھا۔ اور وہ بھی اپنے مفید مطلب اشخاص کو نوازتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے لئے اردو کتابوں کی ضرورت ہوئی تو اہل زبان سے فارسی، سنسکرت اور ہندی کتابوں کے تراجم کرائے اور معقول مشاہرے دئے۔ میر امن دہلوی نے جان گلکرائسٹ کے متعلق بہت کچھ لکھدیا ہے۔ غالب کی مدحت طرازی کے متعلق اکثر اعتراضات ہوتے رہتے ہیں کہ غالب نے انگریزوں کی مدح میں قصیدے لکھے، ان کی خوشامد کی۔ مدحت طرازی و خوشامد ایک خوددار آدمی کی شان کے خلاف ہے۔ مرزا غالب کا دعویٰ خودداری باطل ہے۔ ایسے حضرات نے کلام غالب اور اس وقت کے

---

[۱] کلیات نثر ص ۱۴۴

[۲] خطوط غالب طبع ثانی ص ۸۸

ماحول اور حالات کا مطالعہ دقتِ نظر سے نہیں کیا ورنہ وہ مرزا کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار نہ کرتے۔ غالب معاشی بحران میں مبتلا تھے جس کے متعلق بیان گزر چکا۔ نیز قدر ناشناسی کے اسیر بھی تھے جس کی شکایت انہیں ہمیشہ رہی، غالب بحیثیت شاعر، عرفی، نظیری، ظہوری وغیرہ سے کم مرتبہ نہ تھے بلکہ ان کا مرتبہ کچھ بلند ہی ہے۔ ان شعرا کی قدر و منزلت کی داستانیں معلوم تھیں۔ غالب بھی ایسی ہی قدر و منزلت کے خواہاں تھے، اس میدان میں بھی ان کو اپنی برتری کا احساس بہرحال رہا۔ لیکن زمانہ نے ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا اس سے شعورِ کمتری کا پیدا ہونا ایک لابدی امر تھا۔ غالب نے اپنی برتری کے لئے کوشش کی اور انہیں انگریزوں کے علاوہ اور کوئی نظر نہ آیا جو انہیں بلند مرتبہ دے سکتا۔ چنانچہ خود کو ملکہ کا شاعر بنائے جانے کی تمنا کا اظہار اسی بنا پر کیا ہے۔ ورنہ کلکتہ کے دوران قیام سے لے کر آخر تک انگریزوں کے متعلق جتنے قطعات اور قصائد ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر منظوم عرضیاں ہیں ان کا منشا یہی یہ تھا کہ حکام وقت، پنشن، خلعت، دربار اور خطاب کے بارے میں میری مدد کریں۔ غالب ۱۸۳۴ء میں سپریم کونسل کے ممبر مسٹر چارلس مٹکاف کی مدح میں قصیدہ لکھا تھا[1]۔ اس کے چند شعر دیکھئے بالکل عرضی ہیں۔ قصیدہ سے مستنبط ہوتا ہے کہ مسٹر چارلس مٹکاف دہلی آئے ہیں غالب کلکتہ میں ان سے مل چکے تھے۔ تشبیب کے بعد مدح میں وہی مبالغہ آمیز باتیں دہرائی گئی ہیں جو ہر ایک کے لئے بادنیٰ تغیر بیان ہوتی رہی ہیں پھر اپنی حالت زار بیان کر کے مطلب کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

پنج مطلب ز تو ام ہست بصد گونہ امید
خواہم آں پنج علی الرغم حسود و غماز
اوّل اینست کہ در باب معاشم کہ راست
کنی اندیشۂ محکم بہ طریقِ ایجاز
ہر چہ در دفترِ سرکار بود نقش پذیر
ہم باندازۂ آں نقش شوی بائدہ ساز
دوّم آں کز اثرِ عدل تو اے سنجر عہد
غیر یا بندہ دریں وجہ نباشد انباز
سوّم آنست کہ دیگر نکنم دست طلب
پیش فرمانِدۂ میوات، بدریوزہ دراز
ہم بہ گنجینۂ سرکار براتے خواہم
دادہ انصاف بدیں یافتگی اذنِ جواز
چارم آنست کہ باقی ز دِ چندیں سالہ
بے نزاع و جدل و جہد بمن گردد باز
پنجم آں کز پسِ ایں فتح کہ بنماید روئے
دہیم مژدۂ اکرام و نوید اعزاز
بخشیم تازہ خطابی و بر آں افزائے
خلعتی در خورِ ایں دولت جاوید طراز[1]

غالب کی قادر الکلامی قابلِ داد ہے کہ اپنے مطالب کو کیسے عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس مدحت طرازی کی علتِ غائی معاشی تنگی سے نجات تھی ورنہ ۱۸۲۷ء سے قبل انہوں نے کسی انگریز کی مدح میں ایک شعر بھی نہیں لکھا۔ پس اس کو مطلب برآری کا وسیلہ ہی کہا جائیگا۔ غالب شاعر تھے، انہوں نے صحیح راستہ اختیار کیا کہ شعر کو ذریعۂ اظہارِ مدعا قرار دیا، نثر کے مقابلہ میں شعر کی تاثیر مسلم، اگرچہ غالب کے حق میں شعر کی تاثیر بھی معدوم ہی رہی۔

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غالب نے ہندوستانی امرا و سلاطین کی شان میں بھی قصیدے لکھے ہیں لیکن انہوں نے غالب سے کیا سلوک کیا؟ یہ بات سب پر روشن ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے بھی حکیم احسن اللہ خاں اور حضرت کالے صاحب کی سفارش پر غالب کو ملازم رکھا اور تنخواہ صرف پچاس روپے ماہانہ، تاریخ نویسی خدمت، بعد میں اصلاح شعر کا کام بھی سپرد ہوا۔ انگریزوں کے خزانہ سے ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ ملتے تھے جس کے عوض کوئی خدمت نہیں لی جاتی تھی۔ غدر کے بعد نوابین رامپور نے ضرور (جولائی ۱۸۵۹ء سے) سو روپے ماہانہ سے مدد کی۔ پس یہ اس زمانہ کا طریقہ تھا کہ شاعر کا جس سے توسل ہوتا اسی کی مدح سرائی کرتا۔ اگر غالب کا تعلق پنشن کی وجہ سے انگریزوں کے ساتھ نہ ہوتا تو غالب بھی اوروں کی طرح انگریزوں کی مدح نہ کرتے۔ غالب کی اس مدحت طرازی کی حقیقت اس وقت واضح ہو جاتی ہے جبکہ ہاکنس سنگال غالب کے خلاف رپورٹ کرتا ہے تو غالب اس کی قدح پر اتر آتے ہیں اس کا ایک ہی مطلب ہوا کہ جس سے

[1] کلیات نظم ص ۲۵۶

[1] کلیات نظم ص ۲۵۸

مطلب برآری میں امداد ملنے کی ذرا سی بھی توقع ہوئی اس کو خوش کر کے اپنا کام نکالنا چاہا اور تعریف و توصیف سے اپنی طرف مائل کیا۔ جس نے مخالفت کی اس کی برائی کر دی۔

غالب کی سلامتیِ طبع کے ثبوت ان کی تحریروں میں جا بجا ملتے ہیں، جو اس بات کی بین دلیل ہیں کہ غالب انگریزوں کے متعلق اچھی رائے رکھنے کے باوجود ان کے افعال پر کڑی نکتہ چینی کرتے تھے۔ مولوی سراج الدین احمد کو انگریزوں کے عدل و انصاف کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ہیہات! اگر معاش من ہمیں پنج ہزار روپیہ سالانہ ہم بدیں تفریق از روئے دفتر سرکار کہ سادہ لوحاں آنرا معدلت آثار گویند ثابت شدہ بود بایستے کہ صاحبان صدر مرا از پیش راندندے۔[1]"

"سادہ لوحاں آنرا معدلت آثار گویند" میں کتنا گہرا طنز ہے۔

اسی طرح جب مولوی فضل حق نے سررشتہ داری عدالت سے استعفا دیا ہے تو اہل شہر کو سخت صدمہ ہوا۔ بہادر شاہ ظفر ولی عہد سلطنت تھے انہوں نے بھی بہزار شیون و بکا مولوی صاحب کو رخصت کیا۔ غالب نے یہ تمام حالات مولوی سراج الدین احمد کو ۳۱ جنوری ۱۸۳۲ء کے خط میں لکھے ہیں۔ انگریزوں کے متعلق لکھتے ہیں "بے تمیزی و قدر ناشناسی حکام رنگ آں ریخت[2]" یہ وہ زمانہ ہے کہ غالب کا مقدمہ حکومت کے سامنے ہے۔

ان تمام امور سے قطع نظر، اگر صرف معاملۂ ملازمت مدرسیٔ دہلی کالج کو سامنے رکھا جائے تو واضح ہو جائے کہ غالب کی خودداری کس منزل تک پہنچی ہوئی تھی یہ واقعہ مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں، بعنوان "کیا آن تان ہے" لکھا ہے:۔

"۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام از سرِ نو منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب جو کئی سال تک اضلاع شمال و مغرب کے لفٹنٹ گورنر بھی رہے اُس وقت سیکرٹری تھے۔ وہ مدرسین کے امتحان کے لئے دلی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ مہینے کا ایک مدرس عربی ہے ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔ لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے۔ ان میں مرزا کا نام بھی آیا۔ مرزا صاحب حسبِ الطلب تشریف لائے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی، مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسبِ دستور قدیم صاحب سیکرٹری استقبال کو تشریف لائیں گے۔ جبکہ نہ وہ اُدھر سے آئے، نہ یہ اِدھر سے گئے اور دیر ہوئی تو صاحب سیکرٹری نے جمعدار سے پوچھا۔ وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے، میں کیونکر جاتا۔ جمعدار نے جا کر پھر عرض کی۔ صاحب باہر آئے اور کہا، جب آپ دربار گورنری میں بحیثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی، لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں اُس تعظیم کے مستحق نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت، باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں! صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے[3]"

جیمس ٹامسن جن کے ساتھ یہ معاملہ گزرا غالب کے پرانے جاننے والوں میں سے تھے۔ ان کی مدح میں قطعہ ۲۱، قصیدہ ۳۶ اور ردیف "ش" کی آخری غزل کلیات میں موجود ہے۔ پنج آہنگ میں ان کے نام تین خط ہیں جن میں غزل اور قطعہ بھی شامل ہے۔ یہ پہلے گورنمنٹ کے سکریٹری، پھر فارن سکریٹری اور بعد کو یو پی کے لفٹنٹ گورنر ہوئے۔ دہلی اس زمانہ میں یو پی میں شامل تھی۔ ایسے شخص کے روبرو، مرزا غالب کی یہ جسارت غیر معمولی بات نہیں، اور بغیر ملاقات لوٹ آنا بھی ایک غیر تمدنانہ فعل ہی کہا جا سکتا ہے۔ یا عظمت و برتری کے شدید احساس کا نتیجہ۔ ان کے بعد مومن خاں مومن کو بلایا جاتا ہے وہ بھی ملازمت کرنے سے منع کر دیتے ہیں صرف اس لئے کہ ان کو سو کی جگہ اسی روپے ماہانہ دینا چاہتے تھے[4]۔ ظاہر ہے کہ غالب نے ملازمت عزت کی خاطر قبول نہ کی اور مومن خاں مومن نے صرف بیس روپے کی کمی کی وجہ سے۔ دونوں کا فرق واضح ہے۔

غالب ۱۸۴۴ء میں پنشن کے معاملہ میں بالکل مایوس ہو چکے تھے لیکن ان کو نئے خطاب و اعزاز کی ملکہ وکٹوریہ سے امید تھی۔ یہ اُمید آخری دم تک رہی جو پوری نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک غالب شاہ دہلی سے وابستہ رہے۔ اس زمانہ میں بھی انگریزوں سے رسمی تعلقات رہے۔ وہ شد و مد باقی نہ رہی جس کا ظہور ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۴ء تک ہوا۔ یہ بھی اس کا ثبوت ہے کہ غالب کی مدحت طرازی،

---

[1] کلیات نثر ص ۱۴۴

[2] کلیات نثر ص ۱۴۷

---

[3] آب حیات ص ۴۹۵

[4] آب حیات ص ۴۹۶

مطلب برآری کے لئے تھی البتہ، ۱۸۵۷ء کی "رستخیزِ بے جا" کی وجہ سے انہیں پھر انگریزوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا کیونکہ اس زمانہ میں، پنشن کی بندش، خلعت و درباری اعزاز سے محرومی، ان کے لئے، معاشی بدحالی اور اعزاز کی پائمالی کا سبب تھی۔ اس لئے سب سے پہلے پنشن کے حصول کی کوشش کرنی پڑی اور اس کے بعد خلعت و اعزاز کی بحالی کے لئے تگ و دو ہوئی اور ان دونوں امور کے سلسلہ میں ان کا انگریزوں سے رابطہ رہا۔

اس سلسلہ میں سب سے مقدم "دستنبو" ہے جس میں غالب نے غدر[1] کے واقعات لکھے ہیں۔ یہ کتاب غالب نے چھپوا کر انگریزوں کی نذر کی تھی۔ اسی کتاب کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو ہنگامہ پرور گروہ سے الگ ثابت کرنا چاہتے تھے تاکہ پنشن و خلعت وغیرہ بحال ہو جائے۔ ایام غدر میں تنہائی سے اکتا کر، وقت گزاری کے لئے حالات غدر، دیدہ و شنیدہ قلم بند کرنے شروع کر دیئے۔ مگر کتاب خود شاہد ہے کہ اس میں واقعات و حالات جو کچھ لکھے گئے تھے، بعد کو بر بنائے مصلحت کتاب سے بعض کو نکال دیا ہے۔ بالخصوص حالات دربار شاہ ظفر وغیرہ، مگر جو کچھ لکھا ہے اس کی راستی میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ غالب کی اصلیت پسندی حقیقت نگاری آشکارا ہے۔ انگریزوں کے بے جرم و خطا قتل عام پر اگر اظہار افسوس کیا ہے تو ہندوستان کی تباہی پر بھی خون کے آنسو بہائے ہیں:۔

"دل است، سنگ و آہن نیست، چرا نسوزد، چشم است، رخنہ و روزن نیست، چوں نگرید، آرے ہم بدلِ غم فرماندہاں باید سوخت و ہم بر ویرانی ہندوستان باید گریست"[2] گویا ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

انگریز مرد، عورتوں اور بچوں کے قتل کے متعلق لکھا ہے:۔

"ہای آں جہانداران داد آموز و دانش اندوز نکوخوی نکونام و آہ ازاں خاتونان پری چہرۂ نازک اندام بارخی چوں ماہ و تنی چوں سیم خام و دریغ آں کودکان جہان نادیدہ کہ در شگفتہ روئی بہ لالہ و گل می خندیدند و در خوشخرامی بر کبک و تدرو آہوی می گرفتند کہ ہمہ یکبار بگرداب خوں فرو رفتند"[3]

سر سید احمد خاں نے "اسباب بغاوت ہند" میں ہندوستانیوں کی ناکامی کا سبب، غیر تربیت یافتگی، جہالت، فقدان تنظیم و عدم اتحاد قرار دیا ہے۔ سر سید احمد حکومت کے ملازم تھے انہیں حالات کا زیادہ علم تھا۔ لیکن غالب نے ہندوستانیوں کے لشکر اور ان کے نظام حکومت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سر سید احمد خاں سے کہیں زیادہ وقیع ہے۔

"ایں لشکرہائے بیمرو جنگ جویان بے شمار را جاروب وار کمربند نیکیست۔ آرے رفت و روب ہند بوم، بدانساں کہ آرائش و آسائش، اگر جویند، باندازۂ پرۂ کاہی نیابند۔ ہم چنیں جاروب گیتی آشوب، ہمیں خواست۔ اینک ہزار لشکر نگری، ہم بے لشکر آرای آراستہ، لباسپاہ بینی، بے سپہدار بجنگ برخاستہ"

اور ہندوستان کے شہروں کی حالت ملاحظہ فرمایئے:۔

"شہرہائے بے شہریار، پر از بندہ ہائے بے خداوند۔ چنانکہ باغہائے بے باغباں، پر از درختان نا برومند۔ رہزن از گیر و دار آزاد، بازرگاں از تحفظ خانہ ہا، ویرانہ ہا و کلبہ ہا خوان یغما، گمنامان نہاں خانہ نشیں، تا خویش را آرایند، و شوخ چشمیٔ خویش بمردم نمایند۔ پردہ پردہ، چوں مژہ ہا خنجرہا آختہ۔ و نیک مرداں آسودگی گزیں، دمیکہ بر فتار آیند تا از خانہ بہ بازار آیند، ہزار جا سپر انداختہ۔ دنداں بسکہ در روز، سیم و زر، دلیرانہ ربانید، شبہا از پرنیاں و دیبا بستر خواب آرایند۔ روشن گہراں را روغن نماند کہ شبانہ بکاشانہ چراغ افروزند"[4]

اس سے زیادہ اور کیا بد نظمی ہوگی۔ یہ کتاب انگریزوں کو نذر دی گئی تھی جو بہادر شاہ ظفر کے سخت ترین دشمن تھے۔ لیکن اس میں بادشاہ کے متعلق کتنا درد انگیز بیان ہے اور اس کی بے چارگی کی کتنی بے مثال تشبیہ ہے ؎

شاہ را درمیاں گرفت سپاہ
ویں گرفتن بود گرفتن ماہ

---

[1] اگرچہ آج کل "غدر" کہنا درست نہیں ہے ہمارے نزدیک یہ جنگ آزادی تھی مگر جس عہد کے متعلق ہم گفتگو کر رہے ہیں اس کے لئے ہم اس کے استعمال پر مجبور ہیں "جنگ آزادی" کہہ کر بعض جگہ بات نہیں بنتی۔

[2] کلیات نثر ص ۳۸۳

[3] کلیات نثر ص ۳۸۲

[4] کلیات نثر ص ۳۸۳

ماہ نو ہیچ گہ نمی گیرد
جز مہ چاردہ نمی گیرد
شاہ، ماہ گرفتہ را ماند
نہ کہ ماہ دو ہفتہ را ماند[1]

بادشاہ "گہن لگا چاند" تخیل کی بلندی کا کمال ہے اور اس کی بے بسی اور مجبوری کی کتنی عجیب و لطیف مثال ہے۔ بادشاہ اور شہزادگاں کے حالات، فتح دہلی کے بعد لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہوگا۔ اس لئے بات کو اس طرح ٹال جاتے ہیں :۔

"ایں کہ فرجام کار بادشاہ و بادشاہزادگان کہ روگاہ داستان کشائش شہر بایستے، نخست نہ نگاشتہ ام۔ سبب اینست کہ مرا اندریں نامہ شنیدن سرمایۂ گفتار و ہنوز سخنہائے ناشنیدہ بسیار است[2]۔"

لیکن ایک موقع پر بادشاہ و شاہزادگان کے متعلق افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"از شاہزادگاں بیروں از یں نتواں سرود کہ اندے را اژدہائے مرگ بدہان زخم گلولۂ تفنگ فرو برد۔ وچندے را در جسم بند چاتو بکشاکشِ رسن رواں در تن افسرد۔ وافسردۂ چند ازاں میاں زنداں نشین اند۔ وشمردۂ چند ازاں دودماں آوارۂ روئے زمیں۔ بر بادشاہ ارک آرام گاہ کہ ماتم زدۂ تاب و تواں است، فرمان گیرودار باندازۂ بازپرس رواں ہست[3]۔"

آخر کار دستنبو کی تحریر یکم اگست ۱۸۵۸ء کو ختم کر دی خاتمہ پر لکھتے ہیں :۔

"کہن پنسن اگر بدست آید نیز زنگ از آئینہ نمی زداید.....
کاش در بارۂ آں خواہش ہائے سہ گانہ، ہمانا مہر خواں وسرایائے و مایانہ، چنانکہ ہم دریں نگارش ازاں گزارش آگہی دادہ ام و اینک چشم نگراں بداں دوختہ و دل برامید بداں نہادہ ام[4]۔"

گویا دستنبو کو بھی، خطاب، خلعت اور پنشن کی بحالی کا ذریعہ بتایا ہے۔ اردو خطوط میں بھی دہلی اور اہل دہلی کی بربادی پر دردناک بیانات موجود ہیں سب سے پہلے قطعہ غدر یہ ملاحظہ فرمایئے۔ یہ علاؤ الدین خاں علائی کو اسی زمانہ میں تحریر کیا تھا :۔

بسکہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا؟
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے، شکوہ
سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا[1]

انگریز سپاہیوں کی مطلق العنانی، مسلمانوں کا قتل عام ان کی تباہئ حالات، مجبوری، بے بسی اس سے زیادہ کیا بیان ہو سکتی تھی۔ اب دیکھئے انگریزوں کے ترحم کی مثال بے مثال غالب ہی کا قلم لکھ سکتا ہے :۔

"ہر شخص کی سرنوشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے، نہ قاعدہ ہے، نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی دو بہنیں، سو سو روپے مہینا

---

[1] کلیات نثر صہ ۳۸۵
[2] کلیات نثر صہ ۳۹۵
[3] کلیات نثر صہ ۴۰۱
[4] کلیات نثر صہ ۴۱۰

[1] خطوط غالب صہ ۵۳

پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مجرم تھے۔ تمہاری پنشن ضبط، بطریق ترحم دس دس روپے مہینا تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا! میں خود موجود ہوں، حکام صدر کا روشناس، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سکتا[1]۔"

یہ داستان درازسے درازتر ہوتی جارہی ہے۔ غالب نے غدر کے حالات بہت زیادہ لکھے ہیں صرف دو واقعے اور ملاحظہ فرمائیے، غدر کے بعد دہلی کی عمارات بھی انگریزوں کی تباہی وبربادی کا نشانہ بنیں۔ بہت سی عالی شان عمارتیں برباد ہوئیں۔ مسجدیں مسمار کی گئیں، امام باڑے ڈھائے گئے۔ مولوی محمد باقر کا امام باڑہ ڈھایا گیا تو غالب کو بڑا دکھ ہوا[2]۔ شہر کی بربادی، مسجدوں کی مسماری میں انگریزوں کی حرکتیں ملاحظہ فرمائیے:۔

"بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا، قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا پیوند ہوگئی، سڑک کی وسعت دوچند ہوگئی۔ اللہ اللہ اگنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہرلتے ہیں ایک شیر زور اور پیل تن بندر پیدا ہوا ہے مکانات جابجا ڈھاتا پھرتا ہے۔ فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں جن کو عوام گزی کہتے ہیں، انہیں ہلا ہلا کے ایک ایک بنیاد ڈھادی، اینٹ سے اینٹ بجادی، واہ رے بندر یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر[3]۔"

انگریز کو بندر کہنا کتنی بے مثال تشبیہ ہے۔ میرے لڑکپن تک انگریزوں کے لئے یہ لفظ بچوں اور لڑکوں کی زبان پر تھا۔ مگر غالب نے اس سے جو فائدہ اٹھایا ہے۔ اور جس موقع پر استعمال کیا ہے وہ بلاغت کی انتہا ہے۔ بندر کی فطرت کو سامنے رکھئے اور اس انگریز کی حرکت کو دیکھئے اور تشبیہ کا لطف اٹھائیے۔ اسی طرح انگریز حکام کی جہالت کا خاکہ کتنے پرلطف انداز میں اڑایا ہے۔ ہندوستان میں عرف کی وبا عام ہے۔ نام اور عرف کو انگریز نہ ایک جانتے ہیں اور نہ مانتے ہیں:۔

---

[1] خطوط غالب ص۳۹۵

[2] خطوط غالب ص۳۹۹

[3] خطوط غالب ص۴۹

"ایک لطیفہ پرسوں کا سنو! حافظ ممو بے گناہ ثابت ہو چکے ہیں، رہائی پا چکے، حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض وتصرف ان کا ثابت ہو چکا۔ صرف حکم کی دیر، پرسوں وہ حاضر ہوئے، مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا۔ حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ میں! پھر پوچھا، حافظ ممو کون؟ عرض کیا کہ میں! اصل نام میرا محمد بخش ہے ممو ممو مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممو بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مثل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممو اپنے گھر چلے آئے[1]۔"

ان واقعات میں انگریزوں کے خلاف جو کچھ کہا ہے وہ کم نہیں ہے۔ اب انگریزی فوج کے متعلق بھی سن ہی لیجئے۔ غالب باغیوں کی طرح، انگریزی فوج کو بھی اچھا خیال نہ کرتے تھے:۔

"ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے[2]۔"

کتنے لشکروں کا دہلی پر حملہ ہوا، اور انگریزی فوج نے کیا کیا لوٹا اس کی تفصیل غالب ہی سے سنئے:۔

"پانچ لشکر کا حملہ پے درپے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں[3] کا، اس میں جان ومال وناموس ومکان ومکین وآسمان وزمین وآثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزارہا آدمی بھوک مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا۔ اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب وطاقت عموماً لٹ گئی ہے[4]۔"

انگریزوں نے دہلی میں جو تباہی مچائی تھی اس کو کتنے مختصر اور جامع لفظوں میں بیان کردیا ہے۔ تفسیر کی جائے تو ایک کتاب تیار ہو جائے۔ غالب کا مسلمانوں کی زبوں حالی پر افسوس ایک فطری

---

[1] خطوط غالب ص۳۹۷

[2] خطوط غالب ص۳۰۲

[3] انگریزی فوج، خاکی وردی کی وجہ سے یہ نام دیا ہے دیگر خطوط میں بھی خاکی بمعنی انگریزی سپاہی لکھا ہے۔

[4] خطوط غالب ص۳۵۹

امر تھا خطوط میں جابجا اس کا اظہار پایا جاتا ہے مسجدوں کے انہدام اور ہندیوں کے مکانات کی شان و شوکت کا مقابلہ جس دردناک انداز میں کیا ہے وہ پہلے گزر چکا۔ مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں لکھا ہے کہ مرزا "کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے، پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج و تاسف ہوتا ہے"[1]۔ ان کے کلام میں اس موضوع پر بھی بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ جب پنجاب میں سکھوں کا زور تھا تو مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ تھا، شمالی ہند میں سکھوں کے خلاف کافی غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ مولانا سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید نے انہی کے خلاف جہاد کیا تھا، مومن نے شرکت جہاد کی تمنا کی تھی۔ غالب نے بھی اپنی حسرت کا اظہار ہارڈنگ کے قصیدہ میں جو فتح پنجاب کی خوشی میں لکھا ہے، اس طرح کیا ہے:-

گزاف شیوۂ من نیست راست میگویم — دریں زمانہ مرا بودے ارزمان شباب
پے شکستن کفار بستے بہ نبرد — کمر بہ سر خوشیٔ نیت حصول ثواب[2]

اسی طرح ایک غزل میں درگاہ رب العزت میں کتنے اچھے انداز میں شکوہ پیش کیا ہے۔

نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را — اے بترسا بچگاں کردہ مے ناب سبیل[3]

غرض غالب نے غدر، محرکات غدر، نتائج غدر کے بیان میں سلامتیٔ طبع کا ثبوت دیا ہے۔ انگریزوں کے موافق و مخالف تاثرات کا اظہار گزر چکا ہے۔ اب پنشن اور دربار کے متعلق مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔ انگریزی پنشن مئی ۱۸۵۷ء سے بند ہو گئی تھی اور مئی ۱۸۶۰ء میں بحال ہوئی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے متعدد طریقہ سے کوشش کی۔ ان کے احباب اور قدر دانوں نے بھی حتی الامکان سعی و سفارش کی، دوسروں کی سعی و سفارش منظر عام پر نہیں آسکی لیکن بتقاضائے ہمدردی اس سے انکار کی بھی گنجائش نہیں کہ دوسروں نے در پردہ اس بارے میں ضرور مدد دی ہوگی۔ مگر غالب اس کو "عطیۂ ید اللّٰہی" قرار دیتے ہیں:-

"میرا داروگیر سے بچنا، کرامت اسد اللّٰہی ہے۔ ان پیسوں (پنشن) کا ہاتھ

---

[1] یادگار غالب ص ۹۵

[2] کلیات نظم ص ۲۶۷

[3] کلیات نظم ص ۴۵

آنا عطیہ ید اللّٰہی ہے"[1]۔

اور یوسف مرزا سے جب خواجہ جان نے کہا کہ پنشن کی بحالی میں والیٔ رامپور نواب یوسف علی خاں ناظم کا ہاتھ ہے تو انہیں جواب دیا۔

"خواجہ جان جھوٹ بولتا ہے۔ والیٔ رامپور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔ یہ کام خدا ساز ہے، بہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام"[2]۔

یہی حال خلعت و دربار کا بھی ہے۔ مرزا صاحب کو دربار میں داہنی طرف دسویں نمبر پر کرسی ملتی تھی۔ ہفت پارچہ و سہ رقوم جواہر خلعت میں ملتے تھے۔ غدر کے زمانہ میں اس کی بھی توقع نہ رہی۔ ۱۸۶۳ء میں سر رابرٹ منٹگمری نے دربار کیا مرزا صاحب کو بلایا نہ گیا تھا لیکن ۳ مارچ کو گورنر نے یاد کیا اور خلعت عطا کیا۔ دربار کا مژدہ سنا یا کہ انبالہ جاؤ وہاں دربار ہوگا اور خلعت پاؤ۔ غالب نے اس کی اطلاع قریب قریب سب ملنے والوں کو دی ہے مگر بعض حضرات اس کو درست نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ غالب نے خلعت ملنے کی خبر اپنی کسی مصلحت سے اڑا دی ہو۔ ان حضرات کی یہ رائے اس لئے تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ غالب نے جن حضرات کو اطلاع دی ہے سب کو لکھا ہے کہ لفٹنٹ گورنر پنجاب نے اپنی طرف سے خلعت دیا۔ اس خبر کو انہوں نے اخبارات میں بھی شائع کرانے کی کوشش کی ہے خط بنام منشی نولکشور میں بھی عطائے خلعت کا ذکر موجود ہے۔ یہ خط اودھ اخبار میں شائع ہوا تھا۔ شیو نرائن کو بھی خط لکھا ہے ان کا بھی اخبار نکلا کرتا تھا قیاس ہے کہ اس میں بھی یہ خبر شائع ہوئی ہوگی۔ نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور، منشی غلام غوث خاں بے خبر میر منشی لفٹنٹ گورنر یوپی کو بھی لکھا ہے۔ ایسے حضرات کو غلط خبر دینی کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اخبار میں اشاعت مفید ہی نہیں بلکہ مضر ثابت ہو سکتی تھی، غالب ایسی غلطی کسی حالت میں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں نواب کلب علی خاں کو جو خط دربار اور خلعت کے سلسلہ میں لکھا ہے اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے جس کا پس منظر یہ ہے کہ لفٹنٹ گورنر نے دہلی میں ایک دربار تالیف قلوب کی خاطر کیا تھا جس میں صاحبان فن و کمال کو شرکت کا اعزاز بخشا گیا تھا۔ یہ عام درباروں سے جداگانہ نوعیت کا دربار تھا۔ لفٹنٹ گورنر نے اردو میں تقریر کی تھی۔ اس میں خلعت صرف

---

[1] خطوط غالب ص ۳۸۹

[2] خطوط غالب ص ۴۰۸

غالب ہی کو دیا گیا تھا اور کسی کو نہیں جس کا اظہار روئداد دربار میں بھی ہے اور لفٹنٹ گورنر نے بھی اپنی تقریر میں اردو کی تعریف کرتے ہوئے اس طرح کیا ہے "اس کی شہادت آپ کے مشہور شاعر مرزا نوشہ کے کلام سے جن کو ابھی خلعت دیا گیا ہے ظاہر ہے"۔ کیونکہ معمول کے مطابق دربار نہ تھا اس لئے اس میں خلعت ملنے کی توقع بے محل تھی اس لئے غالب نے یہ صحیح لکھا ہے "نہ مجھے احتمال، نہ صاحب کمشنر بہادر شہر کو علم" اور غالب کے اس لکھنے کو" بعد غدر اگرچہ پنشن اور دربار بحال رہا۔ لیکن خلعت موقوف ہوگیا" سہو پر محمول کرنا چاہیئے۔[1]

غالب کے انگریز حکام کے علاوہ دوسروں سے بھی مراسم تھے۔ جن میں مسٹر جان جاکوب، اور الگزنڈر ہیدرلے کا نام سرفہرست ہے انگریزوں کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"انگریز قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ان میں سے کوئی میرا امیدگاہ تھا اور کوئی میرا شفیق، اور کوئی میرا دوست، اور کوئی میرا یار، اور کوئی میرا شاگرد"[1]

میجر جان جاکوب سے بہت دیرینہ مراسم تھے۔ یہ فارسی کا بڑا اچھا مذاق رکھتا تھا۔ دیوان حافظ کو مرتب کر کے چھپوایا تھا غالب سے دیباچہ لکھوانا چاہا مگر غالب نے تقریظ لکھ دی[2] جو کلیات نثر میں موجود ہے[3]۔ خط و کتابت بھی تھی[4]۔ مکان اور کنویں کی تاریخیں بھی کہی تھیں جو کلیات نظم میں شامل ہیں قطعہ ۳۳ میں اس کا زائچہ بھی نظم کیا ہے۔ یہ غدر میں مارا گیا تھا۔ حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں:۔

"ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا سچ ہے اس کا شیوہ یہ تھا کہ اردو کے فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ یہ بھی انہیں میں سے ہے جن کا میں ماتمی ہوں"[5]

اور منشی تفتہ کو تقریظ دیوان حافظ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"جو تقریظ دیوان حافظ کی بموجب فرمائش میجر جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے۔ اس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں"[1]

الگزنڈر ہیدرلے ایک فرانسیسی خاندان کا فرد تھا۔ اس کے باپ نے کسی ہندوستانی عورت سے شادی کرلی تھی۔ اردو کا بڑا اچھا شاعر تھا۔ ابتدا میں زین العابدین خاں عارف سے شرف تلمذ تھا۔ ۷۔ جولائی ۱۸۶۱ء کو انتقال ہوا[2]۔ اس کے بھائی تامس ہیدرلے نے اس کا دیوان شائع کرایا تھا جس میں غالب سے بھی تلمذ مذکور ہے مگر غالب کے کسی خط سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اپریل ۱۸۶۰ء میں یوسف مرزا کو لکھا ہے:۔

"الگزانڈر ہیدرلے صاحب میرے دوست کے فرزند ہیں اور نیک بخت و سعادت مند ہیں... ... دو مقدموں میں میں نے انہیں خط لکھے مگر انہوں نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا اور ان مقدموں میں سفارش بھی نہیں کی"[3]

پھر ۹ مئی ۱۸۶۰ء کو انہی کو لکھا ہے:۔

"تامس ہدرلے صاحب سے میری ملاقات نہیں ہے۔ ہاں الک صاحب سے ہے، سو ان کے نام کا خط لکھا ہوا تم کو بھیجتا ہوں"[4]

میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"الگزنڈر ہدرلے کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہرا ان کی مصاحبت نہیں ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا"[5]

پھر انہی کو اس کی موت کی خبر دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"الگزنڈر ہدرلے مشہر بہ الک صاحب مر گیا۔ واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور دراج میں

---

[1] غالب از مہر ص۲۶۶
[2] کلیات نثر ص۱۷۱
[3] " " ص۷۵
[4] " " از ص۱۷۱ تا ص۱۷۵
[5] خطوط غالب ص۲۱۰

---

[1] خطوط غالب ص۱۲۰
[2] مقالات ماجد ص۱
[3] خطوط غالب ص۳۰۸
[4] خطوط غالب ص۳۰۹
[5] خطوط غالب ص۲۹۳

اور مجہ میں متوسط تھا۔[1]

ان بیانات میں شاگردی کا ذکر کہیں نہیں لیکن قیاس یہ ہے کہ عارف کے انتقال کے بعد اس نے غالب سے ضرور اصلاح لی ہوگی۔ تا مسیح نے بھی اپنے دیباچہ میں اس کا اعتراف نہیں کیا، البتہ منشی شوکت علی صاحب کے دیباچہ میں غالب کی شاگردی کا ذکر ہے۔[2]

اب تک غالب کے انگریزوں سے روابط بیان کئے گئے۔ میجر جان جاکوب اور اگزنڈر ہیدرے کے علاوہ اوروں سے تعلق تمام تر پنشن، خلعت اور دربار کے سلسلہ میں رہا۔ حصول عظمت و برتری کی خاطر غالب ان روابط کے لئے مجبور تھے۔ اگر غالب نے انگریزوں کی مدح سرائی کی ہے تو ان کی برائی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ لیکن ان روابط نے غالب کو فائدہ بھی پہنچایا ہے۔ غالب طبعاً جدت پسند تھے، شاہراہ عام سے الگ چلنا بھی ان کی فطرت میں تھا۔ طبع معنی یاب نے فکر دور رس پائی تھی۔ پنشن کے قضیہ میں انہیں مالی فائدہ تو نہیں پہنچا، مگر فکر و نظر کے لئے اسباب افادیت فراہم ہوتے رہے۔ دہلی سے کلکتہ کو چلے راستہ میں تجربات حاصل ہوئے۔ یہ احساس برتری ہی تھا کہ لکھنؤ میں معتمد الدولہ آغا میر سے صرف اس لئے نہ ملے کہ اس نے غالب کی یہ دو شرطیں منظور نہ کیں اول یہ کہ نائب السلطنت غالب کی تعظیم دیں، دوسرے نذر پیش کرنے سے معاف رکھا جائے۔[3] باندہ، بنارس، مرشد آباد کا نپور میں بہت سے حضرات سے ملاقات ہوئی۔ بنارس بہت پسند آیا اس کے متعلق مثنوی چراغ دیر ایک عمدہ مثنوی ہے۔ کلکتہ پہنچے۔ وہاں کی ادبی ہنگامہ آرائی نے غالب کو مقلد محض نہ بننے میں بڑی تقویت پہنچائی۔ اس بحث میں بھی احساس برتری اور شعور کمتری کی آویزش کو بڑا دخل ہے۔ ایرانیوں کی تعریف نے دل کے حوصلے بڑھائے۔ مرزا کو جب ایک ایرانی فاضل نے بھری محفل میں غالب کے متعلق کہدیا کہ آج اس درجہ کا شاعر سرزمین ایران میں بھی کوئی نہیں۔[4] غالب کی صلح جوئی بھی "باد مخالف" کے روپ میں ڈھلی۔

---

[1] خطوط غالب ص۲۹۸

[2] مقالات ماجد ص۱۰۱

[3] یادگار غالب ص۳۷

[4] غالب از مہر حاشیہ ص۱۲۶

کلکتہ دار الحکومت تھا پنشن کے مقدمہ میں جہاں ان کو ٹھہرنا پڑا۔ اس قیام کا اثر ان پر بہت اچھا ثابت ہوا۔ انگریزی ایجادات سے وہ شعوری اور لاشعوری طور پر متاثر ہوئے اور انہیں ایک آنے والے دور کا شدید احساس ہوا۔ ان کے طبعی میلانات اس دور آئندہ سے مناسبت رکھتے تھے چنانچہ وہ سب سے پہلے اس کے آثار دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ایسے آثار قائم کئے اور ایسے نقوش چھوڑے کہ ان کے بعد والوں نے انہی کو نشان راہ بنایا اور ایک منزل ارتقا کی طرف قافلہ بڑھایا۔ اس دور آئندہ کے نشانات ان کے کلام میں بکثرت ملتے ہیں مثلاً:

مژدۂ صبح درین تیرہ شبانم دادند ‎ ‎ شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

"مژدۂ صبح" سے مراد دور آئندہ اور "تیرہ شبان" سے مراد دور پستی و بے بجو ہو تو کیا تعجب ہے اور مصرع ثانی ترقی کی نشان دہی کے لئے اشارہ ہو تو کیا بعید ہے مگر یہاں تاریخی شعور سے کام لیا جائے تو بات بنتی ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی دولت ضرور لوٹی، مگر ایک نیا ذہن اور جدید شعور انہی کی بدولت حاصل ہوا۔ غالب کے معاصرین کا کلام دیکھئے وہ اپنے مفروضہ، تنگ اور محدود دائرے سے باہر نکلنا گوارا نہیں کرتے مگر غالب طرح طرح سے دورِ جدید کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک غزل ہے جس کی ردیف "مخسپ" ہے پوری غزل ایک پیام بیداری ہے تشبیہ و استعارہ کے پیرائے میں بہت کچھ کہدیا ہے پوری غزل پڑھئے اور سوچئے کہ غالب نے کیسے عالم میں بیدار کرنے کی کوشش کی ہے بالخصوص یہ شعر:

سحر دمیدہ و گل در دمیدنست، مخسپ!
جہاں جہاں، گل نظارہ چیدنست مخسپ!
تو محو خواب و سحر در تاسف از انجم
بہ پشت دست بہ دنداں گزیدنست مخسپ!
نشان زندگی دل، در دویدنست مایست
جلائے آئینۂ چشم دیدنست، مخسپ!

اور بہت سی غزلوں میں بھی احساس کارفرما ہے چند شعر اور ملاحظہ فرمایئے!

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم
در بزم رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم
بخت در خواب است میخواہم کہ بیدارش کنم
پارۂ غوغائے محشر کو کہ در کارش کنم[1]
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردش رطلِ گراں بگردانیم

اور اردو میں مشہور قطعہ ۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار گر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

میں جو کیفیت ہے اس کو "دیدۂ عبرت نگاہ" اور "گوشِ حقیقت نیوش" ہی کی ضرورت ہے کیونکہ اس کا سرچشمہ "نوائے سروش" ہے گویا دم توڑتی ہوئی مغلیہ تہذیب کی تصویر ۔ ان کے علاوہ غالب کی پیش بینی اور نئے دور کی طرف کھلے اشارے ، آئینِ اکبری کی تقریظ[2] میں ملتے ہیں جو سرسید احمد خاں کی فرمائش پر لکھی گئی تھی اس مثنوی میں انہوں نے سرسید احمد خاں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ پرانے آئین و روش کو چھوڑ کر نئے آئین و ایجادات کی طرف متوجہ ہوں ۔ دیکھیں کہ انگریزوں نے دخانی کشتی ، ریل ، موٹر ، ٹیلیگرام ، ٹیلیفون ، گراموفون ، گیس کی روشنی ، دیا سلائی وغیرہ ، ایجاد کی ہیں اگرچہ سرسید احمد خاں نے اس وقت اس مثنوی کو قبول نہ کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ غالب نے یہ بات اپنی روشن طبع اور بالغ نظری کی وجہ سے بہت پہلے محسوس کر کے لکھدی تھی ۔ غالب کی نگاہ دوربیں ، اس قدیم دور اور تہذیب کو ختم ہوتے دیکھ رہی تھی ۔ اسے ایک نئے دور کی آمد کا شدید احساس تھا ۔ اس سے دورِ جدید کی طرف رخ بدلنے کا عمل بین طور پر دکھائی دیتا ہے جس کی روح ، عقل ، عمل اور تجسس ہے ۔ بنا بریں ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید احمد خاں کو غالب کے بتائے ہوئے راستہ کو اختیار کرنا پڑا ۔

غالب نے صرف انگریزوں کی ایجادات اور آئین ہی کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ انگریزی زبان کے الفاظ کو بھی بکثرت استعمال کیا ہے ۔ ان کے معاصرین کے ہاں اس کثرت سے نہیں پائے جاتے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن حالات سے انہیں دوچار ہونا پڑا ان کے ہم عصر ، ان حالات سے بہت دور تھے ۔ پنشن کے قضیہ اور مقدمہ ، بندش اور بحالی خلعت و دربار کے معاملہ میں انہیں بعض انگریزی لفظوں سے واسطہ پڑا اور انہیں بے تکلف اپنی اردو اور فارسی تحریروں میں استعمال کیا ہے ۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"چاپی ، کہ بائے فارسی اور یائے حطی ہے ۔ کاپی اور ٹاپی اور پاپی یہ قافیہ ہم گر ہو سکتے ہیں ۔ چاپی ، لغت انگریزی ہے ۔ اس زمانے میں اس اسم کا شعر میں لانا جائز ہے ۔ بلکہ مزا دیتا ہے ۔ تار بجلی اور دخانی جہاز کے مضامین میں نے اپنے یاروں کو دئے ہیں ۔ اوروں نے بھی باندھے ہیں ۔ روبکاری اور طلبی اور فوجداری اور سررشتہ داری ، خود یہ الفاظ میں نے باندھے ہیں ۔
چابی بہ معنی کلید شوق سے لکھو نہ چابھی[1] "

الفاظ و اصطلاحات کے علاوہ بہت سے لفظوں کا ترجمہ بھی کیا ہے مثلاً ، ماچس کو انگریزی دیا سلائی ۔ فوٹو کو آئینہ کی تصویر ، عکس کی تصویر ، مارشل لا کو جرنیلی بندوبست ۔ گورنر جنرل کو حاکم اکبر لکھا ہے ۔ دیکھئے ! صاحب ، میم اور بابا کو کیسے عمدہ طور سے اپنے بیوی اور بچوں کے لئے استعمال کرتے ہیں ۔ " پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آرہیں گے[2] " یہی نہیں بلکہ چک ، نوٹ ، رپورٹ کو نظم بھی کیا ہے :

آن دے نہ چک بود نہ تمسک نہ ہرگہ ہست
نے دستخط نہ مہر نہ نام و نشان اوست
مضمونِ شعر نوٹ بود فی زماننا
یعنی بدست ہر کہ بیفتاد آن اوست[3]

غالب کے نزدیک ولایتی یعنی انگریز اردو کو کما حقہ نہیں سمجھ سکتے تھے میر حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں :۔

" آپ ولایتی بھی نہیں جو میں یہ تصور کروں کہ اردو

---

[1] غدر کے بعد بیداری ظاہر ہے غالب کی پیش بینی قابلِ داد ہے ۔
[2] مثنوی کلیات نظم ص۱۰۹ ۔ اس سلسلہ میں میرا مضمون "غالب اور سرسید" مطبوعہ ماہ نو شمارہ بابت فروری ۱۹۶۱ء بھی ملاحظہ کیا جائے ۔

---

[1] خطوط غالب ص۵۴۸
[2] خطوط غالب ص۱۸
[3] کلیات نظم ص۱۴۰

عبارت سے استنباطِ مطلب اچھی طرح نہ کر سکے ہے[1]

انگریز اردو سے نابلد ہونے کی وجہ سے غلط اردو بولتے تھے اس کے متعلق بھی اشارہ کیے ہیں مثلاً "اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو"[2] یا ایک اور جگہ لکھتے ہیں "فریاد مؤنث، فریاد کر لینی چاہیے۔ فریاد کر لینا، انگریزی بولی ہے"[3] غالب اس فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ آج ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اردو کو انگریزی محاورہ سے بچایا جائے۔ انگریزی کے رواج کے متعلق لکھتے ہیں "گل یعنی پھانسی انگریزی لغت ہے۔ انگریزی زبان نے بنگالے میں سو برس اور دلی، اکبرآباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا ہے"[4]

غالب کی تحریروں میں بعض انگریزی لفظوں کا تلفظ بدلا ہوا ہے مثلاً لارڈ کو لاٹ اور لاٹ لکھتے ہیں پنشن کو پنشن، بریگیڈیر کو برگڈیر، سارٹیفکیٹ کو سارٹی فکٹ، اسٹیشن کو اسٹیسن، کیمپ کو کمپ اور کنپ، نمبر کو لمبر لکھا ہے مرزا جواں بخت کے سہرے میں لمبر ہی نظم کیا ہے:

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ

مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

اسی طرح ٹکٹ کو کئی معنی میں استعمال کیا ہے ٹکٹ = اسٹامپ، ٹکٹ = اجازت نامہ (پرمٹ) ٹکٹ = ملاقاتی کارڈ۔ انگریزی الفاظ کی ایک فہرست آخر میں شامل کی جارہی ہے۔

غالب کی اردو نثر میں، خطوط قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی طرزِ تحریر کے متعلق اکثر حضرات کا یہ کہنا ہے کہ یہ انگریزی طرز سے تاثر کا نتیجہ ہے مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

"خط و کتابت میں قدیم اسلوبِ القاب و تخاطب سے کلی احتراز اور محض کسی ایک نام و لقب سے یاد کر کے براہ راست حرفِ مطلب پر آجانا جو اس عہد میں ایک غیر معمولی بات تھی۔ یقیناً انگریزی اسلوب کے تاثر سے سامنے آئی"[5]

مولانا ابوالکلام آزاد کے بیان میں ہمیں اس لئے تامل ہے کہ غالب نے پنج آہنگ کا دیباچہ اور آہنگ اول ۱۸۲۵ء میں ارتجالاً تین روز میں مرتب کر دیا تھا[1] اس میں لکھتے ہیں:

"اداشناس جانتا ہے کہ نگارش میں میری روش یہ ہے کہ جب کاغذ و قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو مکتوب الیہ کو اس کے مرتبہ کے لائق لفظ سے خطاب کرتا ہوں اور مدعا بیان کرنے لگتا ہوں۔ القاب، آداب خیریت گوئی اور عافیت جوئی حشو و زاید ہیں"[2]

دیباچہ ہی میں مکتوب نگار کو ہدایات فرمائی ہیں جن میں بیشتر امور کو ترک کرنے اور اختیار کرنے کے متعلق لکھا ہے ابتدا میں لکھتے ہیں:

"نامہ نگار کو چاہیئے کہ نگارش کو گزارش سے الگ نہ کرے تحریر کو تقریر کا رنگ دے۔ مطلب کو اس طرح ادا کرے کہ اس کا سمجھنا دشوار نہ ہو"[3]

غرض غالب کے دیباچہ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں کہ یہ اسلوب ان کا اپنا ایجاد کردہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریزوں سے ان کے مراسم نہ تھے۔ کلکتہ کی سیر تو درکنار، سفر کلکتہ کا خیال بھی نہ تھا۔ مولانا آزاد نے قیاس سے کام لیا ہے تحقیقی بات نہیں ہے۔ مگر پنڈت دتاتریہ کیفی نے آجکل دہلی بابت ستمبر ۱۹۵۵ء میں ایک مضمون شائع کرایا جس میں غالب کی طرز خطوط نویسی کو غالب کی ایجاد تسلیم نہیں کیا، بلکہ منشی رامچندر کے ایک مضمون مطبوعہ رسالہ محب ہند جلد ۲۹ بابت دسمبر ۱۸۴۹ء و جنوری ۱۸۵۰ء سے اثر پذیری کا نتیجہ اور کامیاب تقلید کا نمونہ قرار دیا ہے۔ اس کے متعلق پھر کبھی سیر حاصل بحث کی جائے گی سردست یہی کافی ہے کہ ۱۸۲۵ء کی تحریر کی موجودگی میں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ منشی رامچندر کا مضمون غالب سے استفادہ کا نتیجہ ہے۔

المختصر یہ امر ناگزیر ہے کہ ہمارے نزدیک رابطۂ فرنگ میں جن کا

---

[1] خطوط غالب ص ۵۷
[2] خطوط غالب ص ۳۹۴
[3] خطوط غالب ص ۵۲۵
[4] خطوط غالب ص ۵۸۵
[5] غالب از مہر ص ۱۱۳

---

[1] کلیات نثر ص ۵
[2] کلیات نثر ص ۶ (ترجمہ)
[3] کلیات نثر ص ۹ (ترجمہ)

تعلق تمام تر خاندانی اعزازات کی برقراری ہی سے نہیں بلکہ غالب کی معیشت سے بھی گہرا ربط ہے۔ اور ان دونوں نے نفسیاتی طور پر ان کو متاثر کیا تھا۔ البتہ جدید آئین و ایجادات سے دلچسپی ان کی ترقی پذیر طبیعت اور جدت پسند فطرت سے مناسبت کے باعث ہے۔ وہ "خُذ ما صفا دع ما کدر" کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ انہوں نے "مے فرنگ" میں نفاست، لذت، بو، رنگ بہتر پایا۔ اس کے فریفتہ ہو گئے۔ اولڈ ٹام، فرنچ، شام پین، کاس ٹیبن، وغیرہ سے رغبت ہو گئی۔ اور شراب قندی ہند سے ہمیشہ نفرت رہی بلکہ اس کے مقابلہ میں شراب کشمیری کو بہتر خیال کرتے تھے:

غالب شراب قندئ ہندم کباب کرد
زیں بعد بادہ ہائے گوارا کشید کرد

شراب قندئ ہندوستاں دماغم سوخت
ز شیرہ خانۂ کشمیرم آورند شراب

ان روابط کے سلسلہ میں بات پھر اسی مرکز پر آ جاتی ہے کہ غالب کی زندگی کے حالات زمانہ کی تاریخی رو سے متصادم ہوئے اور غالب کو کبھی کبھی اپنے بلند معیار سے نیچے اتر کر باتیں کرنی پڑیں۔ نہ صرف انگریزوں کی مدح سرائی بلکہ مسلمان اور ہندو زعماء اور حکمرانوں کی شان میں قصیدہ خوانی بھی اسی منزل سے تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ خود کہتے ہیں:

یک ناید زمن کہ در گفتار
مدحت لالہ سورداس کنم

صاحبان دولت و حکومت کی مدحت سرائی اور قصیدہ خوانی میں جو وقت برباد ہوا اور جو قوت بیان ضائع ہوئی ان کا احساس برتری اس پر آخر عمر تک افسوس کرتا رہا۔ کلیات میں اپنی زندگی کا محاسبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"در ہوائے کہ بال بالا خوانی زدہ ام و در لا دانیکہ
خود را بشگرفی ستودہ ام، نیمۂ ازاں شاہد بازلیست
یعنی ہوا پرستی و نیمہ دیگر تو اگر ستائیست یعنی یاوہ خوانی
.... شادم از آزادی کہ بسا سخن بہنجار عشق بازاں
گزاردستم، و داغم از آزمندی کہ ورقی چند بکردار
دنیا طلباں، در مدح اہل جاہ سیہ کردستم" [1]

---

[1] کلیات نثر ص۲۵ و کلیات نظم ص۸

اب میں غالب کے برتے ہوئے انگریزی الفاظ کی فہرست پیش کرتا ہوں:

1.	TICKET.	ٹکٹ
2.	GOVERNMENT.	گورنمنٹ۔ گورمنٹ
3.	PENSION.	پنسن
4.	DIVISION.	کمشنری
5.	DOCTOR.	ڈاکٹر
6.	CAMP.	کمپ۔ کنب
7.	AGREEMENT.	اگریمنٹ
8.	COLLECTORATE.	کلکٹری
9.	INCOME TAX.	انکم ٹیکس
10.	PARCEL.	پارسل
11.	TIFFIN.	ٹپن
12.	DEPUTY.	ڈپٹی
13.	COMMITTEE.	کمیٹی
14.	RAIL.	ریل
15.	REPORT.	رپورٹ
16.	AGENT.	ایجنٹ۔ اجنٹ
17.	POST PAID.	پوسٹ پید
18.	DEPUTY COMMISSIONER.	ڈپٹی کمشنر
19.	REPLY POST CARD.	ڈبل خط پوسٹ پیڈ
20.	MARTIAL LAW.	جرنیلی بندوبست
21.	BANK.	بنک
22.	REGISTERED.	رجسٹری
23.	GOVERNOR GENERAL.	حکم اکبر، گورنر جنرل،
24.	POCKET.	پاکٹ
25.	LIEUTENANT GOVERNOR.	لفٹنٹ گورنر
26.	PAMPHLET POCKET.	پمفلٹ پاکٹ
27.	BABU.	بابو
28	COPY.	کاپی
29	FRENCH.	فرنچ (کاغذ کا نام)
30.	NUMBER.	نمبر، نمبرہ

No.	English	Urdu
31.	COUNCIL.	کونسل
32.	FRAME. (PLATE)	فرمہ
33.	SECRETARY.	سکریٹری
34.	FRENCH.	فرنچ (شراب کا نام)
35.	CHAMPAIGNE	شام پین
36.	POLICE.	پولیس
37.	STAMP PAID.	اسٹامپ پیڈ
38.	DOUBLE TICKET.	ڈبل ٹکٹ
39.	GAZETTE.	گزٹ
40.	LORDS.	لارڈ۔ لارڈ۔ لاٹ
41.	SECRETARY.	سکرتر۔ سکرٹر
42.	SICK NUMBER.	سک نمبر (زمرۂ بیمار)
43.	CERTIFICATE.	سرٹیفیکٹ۔ سارتی فکٹ
44.	LIQUOR.	لیکور
45.	TICKET.	ٹکٹ (ملاقاتی کارڈ)
46.	DEPUTY COLLECTOR.	ڈپٹی کلکٹر
47.	COMPANY.	کمپنی
48.	APPEAL.	اپیل
49.	ENGLISH.	انگلس
50.	POST.	پوسٹ (ٹکٹ چسپاں)
51.	PAID.	پیڈ (ٹکٹ چسپاں)
52.	STATION.	اسٹیس
53.	COURT OF DIRECTORS.	کورٹ آف ڈرکٹر
54.	REVENUE BOARD.	رینو بوڑد
55.	RESIDENT.	رسیڈنٹ۔ ریزیڈنٹ
56.	RESIDENCY.	ریسیڈنٹی۔ ریزیڈنٹی
57.	AGENCY.	ایجنٹی۔ اجنٹی
58.	AGENT.	ایجنٹ۔ اجنٹ
59.	DECREE.	ڈگری
60.	MAGISTRATE.	مجسٹریٹ
61.	ASSISTANT SECRETARY.	اسسٹنٹ سکرٹر
62.	CHIEF SECRETARY.	چیف سکرٹر
63.	PRESIDENT.	پریسڈنٹ (پریسیڈنٹ)
64.	LONDON.	لنڈن
65.	ENGLAND	انگلینڈ
66.	COMMANDER-IN-CHIEF.	کمنڈر چیف
67.	POST MASTER.	پوسٹ ماسٹر
68.	STAMP.	اسٹامپ
69.	PERMIT.	پرمٹ
70.	COMMISSIONER.	کمشنر
71.	COURT.	کورٹ
72.	TELEGRAM.	تار برقی (ٹیلیگرام)
73.	FINANCIAL COMMISSIONER.	فیناشل کمشنر
74.	NOTE.	نوٹ
75.	CHEQUE.	چک
76.	SESSIONS JUDGE.	سشن جج
77.	EXTRA ASSISTANT.	اکسٹرا اسسٹنٹ
78.	BOX.	بکس
79.	HOSPITAL.	اسپتال
80.	GALLOWS.	گل (پھانسی)
81.	COSTAINE (?)	کاس ٹیلن (شراب)
82.	OLD TOM.	اولڈ ٹام (شراب)
83.	QUEEN'S POET.	کوئنس پوئٹ
84.	BRIGADIER.	برگڈیر، برگیڈیر
85.	GENERAL.	جنرل
86.	INDIAN GOVERNMENT.	انڈیا گورنمنٹ
87.	BARRACK.	بارک
88.	MISS.	مس
89.	MISTER. (MR)	مسٹر
90.	TICKET. (PERMIT)	ٹکٹ (اجازت نامہ)
91.	STEAMER.	دخانی جہاز
92.	MATCH.	انگریزی دیاسلائی
93.	COUNCIL.	کونسل (باہمی مشورہ)

باقی صفحہ [illegible] پر

"گنجفہ بازِ خیال"

(ایک تصوریہ)

رفیق خاور

یہ روشنیاں بعض دھیمی دھیمی، دھندلی دھندلی بعض بجھتی بجھتی اور کچھ ایسی جیسے وہ بجھ چکی ہوں یا کہرے کے بوجھل پردے میں روپوش ہو چکی ہوں۔ یہ سلسلہ دور تک پھیلا ہوا۔ بہت دور، اس قدر کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے نگاہ آبلہ پا ہو جائے ۔۔۔ کتنا دلچسپ اور عجیب ہے! وہ آخری قندیل۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی لو کتنی تیز ہو گئی! اس کی حرارت سے شیشے پر جمی ہوئی نمی کتنی سرعت سے نیچے اترتی جا رہی ہے۔ ہو بہو وہی سماں جو میں نے کلکتہ کی ایک فرنگی تماشہ گاہ میں دیکھا تھا مگر یہاں صبح صادق کے مانندِ کھلتے رنگ کا اجلا اجلا پردہ سرکنے کا عمل ہبوطی ہے صعودی نہیں۔ جیسے اک نگارِ آتشیں رُخ کے تابناک چہرے سے ملاحت آمیز انگوری، سیمیائی آنچل، لغزیدہ لغزیدہ مائل بہ نشیب ہو۔ تمازتِ آفتاب کی بدولت آبجو سے تمام دن کے ابھرتے ہوئے بخارات بھی تو کچھ کم طلسم آفریں نہیں جو پہنائے نظر میں کسی مہروش کے صندلی شانوں پر شبرنگ زلفہائے پریشاں کا سماں پیدا کر رہے ہیں۔

چاندنی چوک کی یہ دلآویزیاں کیونکر فراموش کی جا سکتی ہیں۔ میزاب نما نہر جیسے کسی نے دور تک سیال چاندنی بچھا دی ہو۔ شام کو انسان یہاں نہ آئے تو کہاں جائے۔ لو، قندیل پلک جھپکنے میں اور تیز! اس قدر خیرہ کن! کیونکہ بخارات کا ململ کی طرح باریک غلاف اب بالکل اتر چکا ہے اور روشنی اپنی پوری براقی کے ساتھ کسوتِ بلور کے شفاف سینے سے چھن چھن کر آنے لگی ہے۔ بارالہا! یہ کوندے کی لپک! جیسے جبریلِ امیں دفعتاً اپنی پوری الہامی وجاہت اور کر و فر سے آشکار ہوں۔ نغمہ! ہو بہو وہی! وہی ملکوتی جبیں! وہی لاہوتی چہرہ! ایک پر تمکیں شعلۂ جوالہ، مجاز و حقیقت کے جمیل ترین امتزاج کی فروزاں تمثیل! ایک برس ہونے کو آئے لیکن اس کا یزدانی شکوہ وہی ہے۔ وہی منزہ معصومیت جس میں کثافت کا کوئی شائبہ نہیں۔ وہ پست دیوار جس کے عقب میں وہ اس قدر متانت سے جلوہ افروز ہے، اس کے پرتو جمال سے کیسی سنور گئی ہے! دیوار پر ہمارے نام کندہ! ان کی یکجائیگی میں کس قدر کیف ہے! ایک مقدس محراب پر ابدی ارتسام! یہ دیوار پر لکیریں جیسے مرمریں کفِ دست پر بہم گر پیوستہ خطوط، یہ سبزۂ زنگاری۔ کچھ بھی نہ ہوں پھر بھی سب کچھ ہیں۔

یہ کیا طلسم تھا جس نے مجھے اس قدر مسحور کر دیا! میرے دوست حویلی کی چھت پر کنکوے اڑا رہے تھے۔ کیسے عجیب و غریب کنکوے تھے اور ہم کس ذوق و شوق سے حلقہ باندھ کر لاابالیانہ رقص کرتے، گاتے اور تالیاں بجاتے تھے۔ ایک ایک کر کے ڈور اپنے ہاتھ میں لیتے۔ اڑتی ہوئی پریزاد جیسی کنکیا کو طرح طرح کے پھیر دیتے اور بھاؤ بتانے کی ان گنت صورتیں پیدا کرتے۔ اس سے بے خبر کہ چھت کے نیچے گھر والوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ اور جونہی اس حلقہ میں کھڑے کھڑے مجھے دور سے نغمہ کی جھلک دکھائی دی، جیسے یکلخت قدیم ایرانی کاریگروں کا ایک مجلّی برنجی طبق نظر کے سامنے جگمگا اٹھے، میں سب کو چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف ایک بے پناہ والہیت کے ساتھ دوڑ پڑا جیسے ایک نہایت قوی مقناطیس نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔ وہ خاموش، کم سن تمکنت کی تصویر تھی۔ اسے دیکھتے ہی اُس نو مشقی کے عالم میں بھی بے اختیار کیسا چست شعر منہ سے نکل گیا جیسے عین وقت پر روح القدس کی طرف سے فیضان ہوا ہو:۔

خموشیوں سے تماشہ ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے تری سرمہ سا نکلتی ہے

باقی غزل تو برسوں بعد جیسے بنی سو بنی مگر خلوص اور واقعیت نے مطلع میں جو رنگ پیدا کر دیا ہے، اسی کا حصہ ہے۔ نغمہ سر سے پاؤں

تک جلال تھی۔ اس کی خموشی میرے لاأبالیانہ پن پر ایک متین سرزنش تھی۔ وہ میرے دل و دماغ پر یہ گہرا نقش ثبت کرکے نہ جانے کہاں چلی گئی، کن خلاؤں میں روپوش ہوگئی۔ لیکن کوئی خلا اسے جذب نہیں کرسکتا۔ وہ اب بھی جب چاہے سراپردۂ اسرار سے نکل کر اسی سطوت و جلال کے ساتھ جلوہ گر ہوسکتی ہے۔ نغمہ مجھ سے دور نہیں ہوئی۔ وہ میری تھی، وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہی اور زندگی کی مہیب پستیوں۔ فاتحانہ سربلندیوں۔ شدید سے شدید بحرانوں عظیم سے عظیم طوفانوں اور زبوں سے زبوں افتادوں میں میرے ساتھ رہی جیسے خود حسنِ مثالی کی شان کبریائی کائناتِ سفلی پر دائماً پرتو ڈالتی ہے۔ اسی طرح اس کا پیکرِ جمیل بھی میری ہستی پر پرتو فگن ہے۔ میری زندگی کے ہمیشہ دو دھارے رہے۔ نغمہ نے دفعتہً نمودار ہوکر ان میں ایک اور زبردست دھارا ملا دیا۔ اس نے زیریں دھارے ہیں۔ میں اسے زیریں ہی کہوں گا کیونکہ گو یہ بظاہر اتنا نمایاں نہ تھا لیکن تھا زیادہ گہرا اور پرزور — ایک طوفانی کیفیت پیدا کردی جیسے قدرت نے اس کو دفعتہً ایک اور ہی قوت اور گیرائی عطا کردی ہو۔

مجھے خوب یاد ہے۔ اس دن اور اس کے بعد جب بھی میں تاج محل گیا مجھے اس میں ایک اور ہی شان' اور ہی معنی دکھائی دیئے۔ مجھے اس میں نغمہ ہی نغمہ تحلیل نظر آتی تھی۔ اور اس کی تمکنت نے اسے متانت سے ماورا متانت' جمال سے ماورا جمال عطا کردیا تھا۔ اور تاج محل پر ہی کیا منحصر ہے، مجھے اپنے ہر فعل' ہر خیال' ہر لفظ اور قدرت کی ہر چیز میں یہی شان ارجمندی دکھائی دینے لگی۔ اب اس قندیل نے دفعتہً روشن ہوکر جو یہ کہربائی صورت اختیار کرلی ہے۔ تو اس سے روح میں پھر کس قدر تجلیاں پھوٹ رہی ہیں اور کتنے ہی تار تپ تپ کر لو دینے لگے ہیں۔ سرخ رنگ بھی کیا قیامت ہے۔ مجھے پھر یاد آیا۔ اس شعر پر نغمہ کی کیسی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ ہاں ہاں نغمہ ہی کے شفق گوں چہرے کی چھوٹ:

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب
شیشۂ مے سرو سبز جو ئبار نغمہ ہے

اب کسی کو کیا معلوم کہ یہ سچ مچ کے نشے یا کنار جو محفلِ نا و نوش کا ذکر نہیں بلکہ شیشۂ مے کسی کے جمیل پیکر کی مبدل صورت ہے۔ جو نو برس کی عمر میں بھی سرو کی سی بلندی اور تحمل پیدا کرتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اللہ اللہ! میرے نشے — جذباتی اور وجدانی نشے — اس کے مافوق البشر رنگ سے کیسے شاداب و سرشار ہوئے۔ اور ان کی مستیاں میری رگ رگ اور ریشے ریشے میں دوڑ دوڑ کر میرے اشعار۔ ان کے بحور۔ ان کے ترنم۔ ان کے لفظ لفظ میں کسی التہابی شعریت کے ساتھ سرایت کرگئیں۔ اس اولیں احساس نے میرے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں کیا کیا پُرکار یادیں چھوڑ دی ہیں:۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں

بس بس یہیں تک۔ اس غزل کا برا ہو۔ آدمی چلتا کس طرف ہے اور یہ اسے کھینچ کھینچ کر کہاں لے جاتی ہے۔ معاذ اللہ! میں یہ غزل لکھتے لکھتے بہک کر کہاں کا کہاں چلا گیا۔ یہ بھی میں نے کہنے ہی کو کہہ دیا تھا کہ "اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں"۔ ورنہ خوب جانتا ہوں میری شخصیت، میرے کلام کا کوئی ذرہ بے پرتو خورشید نہیں۔ اس میں نغمہ ہی کی بھرپور رعنائی کا تلاطم ہے۔

طبعِ انسانی بھی کیا طرفہ تماشہ ہے۔ یہ احساس تھا کب کا اور ادا کب ہوا۔ گویا میں اسے اتنے برس اپنے ساتھ لئے پھرا۔ اب کسی کو یہ بتاؤں تو وہ مجھ پر بے اختیار ہنس دے گا۔ کہے گا' سچ مچ سٹھیا گئے ہو۔ لیکن یہ راز تو میں ہی جانتا ہوں کہ جب قویٰ مضمحل ہوگئے اور عناصر میں کوئی اعتدال نہ رہا۔ تو کوئی کرشمۂ غیبی بر سوں سے دل کی تہوں میں خریدہ احساس کو بروئے کار لے آیا۔ اب اگر اس میں بچپنے کے چنچل پن اور شباب کے شور و مستی کی بجائے بڑھاپے کی نڈھال انفعالیت نہ ہو تو اور کیا ہو؟

ایک محبت ثبات پیدا کرتی ہے، دوسری بیزاری۔ نغمہ نے — میں اسے محبت کہوں یا وفاق روحانی۔ مجھے اس محبت کا کیف سرمدی عطا کیا جو ثبات پیدا کرتی ہے۔ یہ بھی اس کے "مافوق النساء"

ہونے کا عجیب کرشمہ تھا۔ یہ حسرت آمیز غزل اس ہی کی تو دین ہے،

یار در عہد جوانی بہ کنار آمد و رفت
ہمچو عیدے کہ بہ ایام بہار آمد و رفت

یہ کیا لطیف درد تھا جو نغمہ نے مجھے عطا کیا اور روپوش ہو گئی۔ کیا خبر ظہوری کو بھی ایسا ہی تجربہ ہوا ہو اور اس نے میرے ہی دل کی کیفیت شعر کے پردے میں یوں کھول کر رکھ دی ہو۔

شد طبیب ما محبت۔ منتش بر جانِ ما
محنت ما، راحت ما، درد ما، آزار ما

اور رومی کی روح ابدالآباد تک خوش رہے۔ جس نے یہ ترانۂ الہامی انشا کیا:

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علتہائے ما

کچھ ان اشعار کا والہانہ کیف۔ کچھ احساس جبلی اور کچھ طبع زود رس اور تخیل شگرف کار کی کارفرمائی — یہ قصہ ہے تب کا کہ آتش جواں تھا۔ مجھے بھی ان کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس احساس کی ترجمانی کرتے ہی بن پڑی۔ کیا اچھا ہوا کہ اس احساس میں ان دونوں اہل دل اور میرے شعور کی روحیں یکجا ہو گئیں۔ یہ احساس میرے دل پر چھا گیا، میرا بن گیا، میں اسے اپنائے بغیر نہ رہ سکا۔ کیا مجال کوئی خیال ایک بار اپنی ندرت، مسائل حیات پر غور و فکر یا دوسروں سے اثر پذیری کے سبب ایک بار ذہن میں جاگزیں ہو جائے اور نطق کے سانچے میں نہ ڈھلے۔ چنانچہ یہ گراں مایہ احساس بھی لباس نغمگی سے آراستہ ہو کر رہا اور کس شان سے:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ لادوا پایا

اس میں "درد لادوا" کی رمز خفی اور کسک کو میرے سوا اور کون جانے؟ ہائے یہ شوریدگی! یہ مستی! اس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا — خوب یاد آیا۔ جب میں اور نغمہ آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ایک تمام حسن، ایک تمام شوق۔ ایک سراپا تجلی، ایک سراپا نظارہ۔ اور ہم ایک خاموش تکلم سے اپنے واردات کو تمثیل کر رہے تھے تو میں ایسا محسوس کرتا تھا گویا قدرت نے مجھے ایک لباس فاخرہ پہنا دیا ہے۔ میں اتنا سربلند ہو گیا ہوں کہ میرا سر آسمان بوس ہے اور جسم کی گیرائی کہ تمام آفاق پر مستولی۔ خدا جانے یہ کیسا احساس تھا۔ ایک عجیب احساس۔ اور پھر عجیب تر یہ کہ میرے شعور میں کچھ ایسی ذکاوت۔ حواس میں ایسی تیزی اور تخیل میں ایسی برانگیختگی پیدا ہوئی گویا دفعتہً مجھ پر سینکڑوں دروازے کھل گئے۔ دل کی عمیق ترین تہوں سے خیال پر خیال شلالہ وار بلند ہوئے یہ کیوں ہوا۔ کیسے ہوا؟ آج بھی میری عقل اس سلسلہ میں میری رہنمائی نہیں کرتی کتنی عجیب بات ہے میں نے کاوشِ فکر سے تو کبھی ان خیالات کا ادراک کیا ہی نہیں تھا۔ نہ مجھ پر سچ مچ کوئی کیفیت طاری ہوتی اور نہ کوئی ایسے ارتسامات ہی تھے جو میں نے کبھی قبول کئے اور دل کے گوشے میں محفوظ کر لئے تاکہ انہیں دریا برد ہونے کے بعد پھر برآمد کروں۔ اگر کوئی یہ کہے بھی تو میں نہیں مانوں گا کہ ظاہری قوتی نے اس حشرِ خیالات میں حصہ لیا۔ پھر یہ یک بیک نمودار کیسے ہو گئے؟ میں تو یہ سوچتے سوچتے عاجز آ گیا ہوں۔ شاید ہم اُن اجرام سماوی کی طرح ہیں جو روشنی کے ایک سیمیائی غبار میں گردش کرتے ہیں۔ اس لئے جوں جوں ہم اس کے مختلف طبقات میں داخل ہوتے ہیں۔ کوئی طلسماتی پارہ دوچار ہوتا ہے۔ یا پھر یہ ستارہ ستارہ غبار شاید انسانی فطرت کے عالم اصغر میں پنہاں ہے جو التزاماً عالم اکبر بھی ہے۔ اگر اسے غیب نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

آج یہ پرانی یادیں پھر میرے دل میں رہ رہ کر کیوں ابھر رہی ہیں؟ — یاد آنے دو۔ یہ یادیں بہت لطیف ہیں۔ یہ میری تمام زندگی کا حاصل ہیں۔ محبت کیا ہے؟ نغمہ کی ملاقات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کئی دن تک نہ کھیلنے کو جی چاہا اور نہ کہیں آنے جانے کو۔ میں اپنے آپ میں کھو گیا تھا۔ چاندنی رات کو برجِ مثمن کے پاس جہاں سے تاج محل کا گنبد نور اعلیٰ نور دکھائی دیتا تھا اور کائنات کے بقعۂ نور میں ایک اور جلوۂ نورانی معلوم ہوتا تھا۔ ایک گھاس کے تختے پر بیٹھ جاتا۔ اور سوچنے لگتا۔ چاندنی کی طرح صاف دھلی ہوئی محبت میں بھی کیا جادو ہے! دور جمنا کی بہکی بہکی، دھیمی دھیمی، گنگناتی ہوئی لہروں کی طلسمی آواز مجھے نغمہ کا خاموش تکلم معلوم ہوتی۔

میں نے محسوس کیا کہ محبت انسان کو کچھ اور ہی بنا دیتی ہے۔ وہ اس دنیائے آب و گل میں پا بجولاں نہیں رہتا۔ اس کی روح اس دنیا سے رم نہیں کرتی۔ بلکہ وہ اس کی روح کو اپنے اندر جذب کرکے اس سے بلند تر ہو جاتی ہے۔ اس میں ایک زبردست ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ جیسے اس کے جان و دل میں کسی نے برقی جوہر بھر دیئے ہوں۔ اس کی روح میں ایک بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے پہلو میں زندگی کی ایک نئی دھڑکن محسوس کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو یزدانی قوتوں کا مظہرِ اتم تصور کرنے لگتا ہے۔

اور پھر یہ ذوق و شوق کتنا جانگسل، کتنا جانگداز ہے! میں نے نغمہ سے جدا ہو کر ایسا محسوس کیا گویا میں اپنے آپ سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ اور میرے دل میں ایک خلش پیدا ہوئی۔ یہ خلش رفتہ رفتہ جاوداں ہو گئی۔ نہیں یہ شروع ہی سے جاوداں تھی۔ یہ تو ایک ایسی رود بار ہے جو اپنے اطراف و جوانب سے مختلف النوع زریں و نقرئی پارے اور لعل و جواہر جمع کرتی اور پاکیزہ چکنی مٹی سے آمیز ہو کر خبر نہیں کیسے کیسے دلکش اور حسین قالب اختیار کرتی ہے۔ اس نے میرے تخیل کی دنیا میں کیا کیا رنگا رنگی پیدا نہیں کی ہے۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

نغمہ! تیری ملاقات میرا سب سے بڑا المیہ تھی اور سب سے بڑا طربیہ بھی۔ تو میرے ذہن پر حسن مثالی بن کر کچھ اس طرح نقش ہو گئی کہ میں اور کسی پیکرِ جمال سے مطمئن نہ ہو سکا۔ تیرے مثیل کی تلاش ایک مستقل محرومی اور لب تشنگی کا باعث ہوئی۔ میری اپنی رفیقۂ حیات امراؤ بیگم، ہزاروں میں ایک ہو، پھر بھی کیا — وہ نغمہ کی مثیل نہیں ہو سکتی۔

سوچتا ہوں یہ خواب اور شبہائے ہجر کا ذکر محض تقاضائے بیاں سے ہوا۔ ورنہ حقیقتاً ہجر کی ایک مستقل رات ہے اور وہ بیداری جس میں محبوب سے ملاقات ہو ایک جاودانی خواب جس میں وہ دوبارہ ملاقات کا وعدہ کرکے رخصت ہو جاتا ہے!

ہر چند نغمہ سے دید و وادید ثبات آشنا نہ ہوئی پھر بھی قدرت اس کا بدل بن گئی۔ اس کے رنگا رنگ جلوے اس کا عکس پیش کرنے لگے اور ان میں باوجودِ مغایرت ایک شانِ وحدت منعکس ہوئی۔ کائنات کے ذروۂ اقصیٰ پر ایک التہابی مجسمہ نصب ہو گیا جس کے پاؤں دنیائے آب و گل کی قدم گاہ پر متمکن تھے۔ یہ مجسمہ نغمہ ہی کا بروز تھا۔ آخر یہ کائنات ایک "ایزدی آتش"[1] کا فروغ نہیں تو اور کیا ہے؟

اب پھر وہی طلسم! ایک وجد۔ ایک استغراق کی لہر پھر مجھے اپنے جسمانی حدود سے پرے لے گئی۔ وہی عشق کی والہانہ شورش جو عاشق کو صوفیاء کی مستی و حال سے روشناس کرتی ہے۔ ہاں ہاں یہ صوفی بھی تو دیوانگانِ عشق ہی کے ہم طبع ہیں۔ انہیں سماع اور حال کی طلب کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ ایک محیطِ اعظم میں پہنچ جائیں۔ کائنات "دل" کس کا محیط؟ شاید دونوں کا۔ اس کا سبب؟ دنیائے مجاز سے گریز؟ نہیں۔ بلکہ ایک وسیع تر عالم کا ادراک۔

ہاں تخیل کی لہر مجھے دور لے جاتی ہے۔ وہ دیکھو ایک طلسمی منبع نور سے تجلی کی ایک سیل جاری ہوئی۔ جو لگاتار بہے جاتی ہے۔ یہ جوہر۔ یہ عرض۔ یہ سبزہ۔ یہ گل۔ یہ ابر۔ یہ "پری چہرہ لوگ" تمام اسی کے مظاہر ہیں اور اس سیل تجلی کے اجزا میں ہستی کیا ہے؟ ایک بہاؤ۔ اس بہاؤ کی روح وحدت ہے، کثرت نہیں۔ میں تو یہ کہتے کہتے تھک گیا اور شاید آخری دم تک کہتا رہوں گا کہ

نہ ہو بہرزہ بیاباں نوردِ وہم وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز

میں نے اسی بہاؤ میں بہنا شروع کیا۔ یہ مجھے نغمہ ہی کے وجدانی اثر کی ودیعت تھی۔ میں نے دیکھا ہی نہیں۔ یہ خیرہ کن قندیل مدھم ہوتے ہوتے بجھ گئی۔ اس کی روشنی نے گرد و پیش کے بخارات سے کتنے ہیولے پیدا کئے۔ اور اب وہ کہاں ہوا ہو گئی؟ یہ ادھر پاس ہی ایک اور "چراغ تہ داماں" ہے بخارات کا پردہ ہٹ گیا لیکن "موجہ ہائے دود" اسے بدستور لپٹی ہیں۔ اس سے نظریں ہٹا ہی لی جائیں تو بہتر ہے۔ میں بھی کیا "خفقانی" ہوں۔ ان تابناک قنادیل سے، موہوم باتوں کے تار و پود سے "افسانہ ہائے غیر مکرر"

---

[1] فروزینہ ایزدی آتشم — غالب

طرح دیتا ہوں۔ یہ تاج ہے۔ یہ قلعہ اکبر آباد ہے، یہ جامع مسجد، یہ چاندنی چوک، یہ قلعہ شاہجہاں۔ اور یہ میرا اپنا کلبۂ احزاں! دنیا اور اس کے تماشہ ہائے روز و شب سے دلبستگی ـــ فانوسِ خیال میں روشنی اسی کی شرمندۂ احساں ہے۔ کبھی انسانی تمناؤں کے چراغ بھی بجھے ہیں۔ یہ تو آخری دم تک اس کے نہاں خانۂ دل میں روشن رہیں گے۔ آج جب "گنجفہ باز خیال" نئے نئے ورق الٹ الٹ کر "نیرنگ، یک بت خانہ" کا منظر دکھا رہا ہے، مجھے سالہا سال کے فراموش شدہ افسانے یاد آتے ہیں۔ کتنی ہی آرزوؤں اور مسرتوں کے تصور میرے ذہن میں رقص کرتے ہیں۔ ہائے! اس "کافر ادا" اور "رہزنِ تمکین و ہوش" گلنار سے "رسم و رہ شوق" جس کی وجہ سے امراؤ بیگم کے ساتھ اس قدر خلفشار پیدا ہوا۔ میں چاہوں بھی تو اِن جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش عشرتوں کو صفحۂ خاطر سے محو نہیں کر سکتا۔ میں نے اس وقت بے محابا کہہ دیا تھا اور بعد میں بھی بار بار زبان پر لاتا رہا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

وہ زبان پھر کہاں سے لاؤں جس نے کبھی اس پارۂ سحر کو پردۂ غیب سے منصۂ شہود پر جلوہ گر کیا تھا:

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

مگر میں پوچھتا ہوں۔ عشرتِ شباب سے گریز کیوں؟ یہ تو عین مقتضائے حیات ہے اور گرمیٔ طبیعت جویائے نشاط۔ یہ چند در چند خوشگوار لمحے! وہ حریفانِ خود آرائے ذوق کا مجولی۔ عشرت کے یہ بحرانی لمحے کس قدر رنگین تھے۔ جب حسن و رعنائی کے یاسمن زار پوری آب و تاب سے جلوہ فروش تھے۔ نشۂ فکر کے عالم میں اس لطافت نے شوخیٔ تحریر کی بدولت صفحۂ قرطاس پر شعر کا کیسا نادر پیکر اختیار کیا۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

میں اس سرچشمۂ فیض، نغمہ کا احسان کیسے فراموش کروں کہ جب گلنار کی بالا نشیں رعنائی مجھے نہ جانے کن گہرائیوں میں لے گئی تو ـــ اب ان بے پایاں نوازشوں کا تذکرہ ہی کیا جن سے میری حیات ابد تک زیر بار رہے گی۔

لو، وہ اس سرے کی قندیل پھر یکبار کیسے چمک اٹھی۔ اس کی وہ سرخ لو فانوسِ بلوریں اور بخارات سے چھن چھن کر آتی ہوئی کتنی بالیدہ معلوم ہوتی ہے۔ ساری قندیل ایک دہکتا انگارہ ہے انگارہ۔ ایک دہکتا چہرہ! اتنا کشادہ، اتنا باوقار، ملکوتی اور جلیل۔ جیسے گلاب کا تمتماتا ہوا پھول! میری ہی طرف عناں گسیختہ رواں ہے۔ یہ کہیں قریب ہی ہے۔ بہت ہی قریب! دیوار کے اس طرف، نہیں ادھر۔ یہ بھبوکا، جو کسی دھند میں گھرے ہوئے گوشے سے نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک شعلۂ جوالہ! یہ لو، یہ زبانِ آتشیں، اس قدر قریب۔ جیسے یہ میری نظر، میرے دل سے خروج کر رہی ہو! کوئی سمجھے، انفس و آفاق مدغم ہو گئے ہیں اور ان کے مطلع پر ایک برقِ تجلّی ضو فگن ہے۔ قندیل!؟ نغمہ!؟ کون؟ کون؟ ٭

غالبؔ کا رابطۂ فرنگ ـــ بقیہ صفحہ ۳۵

No.	English	Urdu
94.	MAJOR.	میجر
95.	PIECES OF STAMP. (TICKET)	اسٹامپ کے ٹکڑے
96.	DOUBLE.	ڈبل
97.	CHAPPY.	چاپی (کھردرا، شگاف دار
98.	MAGAZINE.	میگزین (بارود خانہ)
99.	PHOTOGRAPH. (PHOTO	عکس کی تصویر۔ آئینی تصویر(
100.	(P.M.G) POST MASTER GENERAL.	بڑا پوسٹ ماسٹر
101.	GOVERNOR GENERAL.	گورنر جنرل
102.	GOVERNOR.	گورنر
103.	COLONEL.	کرنل

فکاہیہ:

"اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے"

(غالبؔ انگل ووڈ میں!)

قربان حسین

ہالی ووڈ یعنی فلمیں — یا انگل ووڈ — ہر وہ جگہ جہاں مرزا نوشہ اور ان کے ہوا خواہوں کا گزر ہو — غالبؔ کی دسترس کہاں نہیں؟
اس لئے کہ خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا! اور مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں، جبکہ چلتے ہوں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں۔
"جاوید نامہ" میں ارواحِ جلیلہ حلاج و غالبؔ و قرۃ العین طاہرہ کو یاد رکھئے کہ "بہ نشیمن بہشتی نگرد یدند و بگردش جاوداں گرائیدند" غالبؔ کے اپنے الفاظ میں —
"وحشت پہ میری عرصۂ آفاق (افلاک!) تنگ تھا" کچھ تعجب نہیں کہ عالمِ ارواح اور حورانِ خلد (جس میں لاکھوں .....) سے بیزار ہو کر یہ جنونِ جولاں
پھر عالمِ اجسام کی طرف آنکلا ہو — اُس در پہ نہیں بار تو امریکہ ہی ہو آئے! اور وہ ایک بزرگ کی شکل میں انگل ووڈ کے حال ساکن، قربان حسین
کے ہم سفر ہوئے ہوں۔ اس نزولِ ثانی کا ثبوت مدیر "ماہِ نو" کے اس شائبہ سے بھی ہم پہنچتا ہے کہ اس سفرِ بے سنگ و میل اور حضرِ بے برگ و ساماں
میں مضمون نگار کے ساتھ ساتھ مرزا کے شریکِ سفر اور "وقفِ ہم زبانی ہا" رہے — اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — بہرحال یہ سب
ماجرا "اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی" — (ر۔ خ)

دل قدرے اداس تھا، سوچنے لگا کیا کروں کئی خیال آئے۔ کبھی سوچا کافی شاپ میں چل کر بیٹھوں۔ کبھی یہ کہ کوئی فلم دیکھ لیا جائے مگر کوئی تجویز بھی نہ جچی پھر سوچا کسی دوست سے ملنے جاؤں، مگر وسوسہ ہوا کہ اس سے ملنے گئے اور وہ نہ ملا یا اس کا کوئی اور پروگرام ہوا تو سخت کوفت ہوگی۔ اس حیص بیص کے بعد فیصلہ کیا کہ چلو "انٹرنیشنل ایئرپورٹ" ہی چلا جائے جہاں تازہ واردانِ بساطِ ہوا کو دیکھنے اور نئے نئے چہرے، رنگا رنگ لباس۔ دیس دیس کے لوگوں کو دیکھ کر وقت گزرنے کا موقع ملے گا۔ یوں ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو۔

اپنے پاس سن ترپن کی ڈربی پرانی "فورڈ" تھی۔ اس ہمدمِ دیرینہ کا ساتھ چھوڑنا دل کو گوارا نہ ہوا، اس لئے اسی پر سوار ہو کر چل نکلے۔ سڑک کی اونچ نیچ اور گڑھوں سے بچتے بچاتے، ہچکولے کھاتے کسی نہ کسی طرح ایئرپورٹ تک پہنچ ہی گئے اور گاڑی کو "پارکنگ لاٹ" میں کھڑا کر دیا۔

سوچا گیلری سے نظارہ اچھا رہیگا۔ ہر دو منٹ بعد کوئی نہ کوئی جہاز آتا جاتا ہے۔ امریکی، انگریز، فرانسیسی، جرمنی، اطالوی، ہوائین۔ غرض قدرت کے کارخانے کے ہر نمونے کو یہاں دیکھ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی اپنے پیارے وطن سے بھی آیا ہو۔ اس سے مل کر پوچھیں: "کس حال میں ہیں یارانِ وطن؟" اپنی کہیں گے، ان کی سنیں گے اور کچھ نہیں تو گھر کے واقعات سے ہی آگاہی ہوگی — سو ہم جیسے دُور افتادوں کے لئے یہ بھی کیا کم ہے۔

چلتے چلاتے جاپان ایئرلائن کی طرف جا نکلے۔ ہر طرف رنگینی، گلکاری، نشاط اور خوش وقتی نظر آئی۔ یہ مشرق ہی تو تھا۔ دیکھ کر خاکِ وطن یاد آگئی۔ ابھی دور نہیں گیا تھا کہ دور ایک سیاہ ٹوپی نظر پڑی۔ دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ سوچا ضرور کوئی پیارا ہموطن ہے۔ مگر نزدیک جا کر دیکھا۔ یہ آجکل کی سیاہ قراقلی تو نہ تھی — مگر اس کی بزرگ کلاہ پاپاخ ضرور تھی۔ یہ ایک نووارد بزرگ تھے۔ بڑھ کر "السلام علیکم قبلہ آداب عرض کرتا ہوں!" داغ دیا۔ بڑے میاں نے میرے سراپا کو دیکھا اور جواب میں کہنے لگے "میاں لڑکے، تم بڑے بدوضع ہو گئے ہو۔

لباس کا بھی خیال نہیں رکھتے۔ نہ سر پر ٹوپی، نہ چھوٹوں کا پاس نہ بڑوں کا ادب"۔ میں کچھ محجوب ہو گیا اور مسمسی صورت بنا کر کہا "معذرت کا خواستگار ہوں"۔ بولے "خیر، جانے دو اس بات کو، مگر یہ تو بتاؤ تم کون ہو اور کیا شغل ہے؟" عرض کیا "حضرت، مجھے قربان کہتے ہیں۔ طلبِ علم کے لئے یہاں آیا ہوں"۔

"خوب، خوب، نام بھی خوب ہے، قربان جائیے۔ مگر کہاں سے آنا ہوا؟"

"پاکستان سے"

"خوب۔ بلکہ خوب تر شد"

"حضور نے اِدھر کیسے تکلیف فرمائی؟"

"بھئی بہت زمانہ سے جنت کی فضاؤں میں رہا ہوا تھا، دل اچاٹ ہو گیا۔ وہی حور وہی قصور، ہیں سیلانی جیوڑا ٹھہرا، سوچا پھر سیرِ دنیا کے لئے نکل چلوں۔ رضواں سے بہت ہی لڑائی ہوئی مگر آخر کار اس نے دو دن کی رخصت دے ہی دی۔ میاں، یہ تو جانتے ہی ہو کہ آسمان کا در کھلے تو یہاں کی ہر چیز نظر آتی ہے۔ میں بھی دریچے میں سے جھانکا کرتا تھا۔ ایک مقام پر بہت بڑے مینار اور بڑی چہل پہل نظر آئی۔ میخانہ اور ساقی بھی ساتھ ساتھ دکھائی دئے۔ 'مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے' میں پہلے ہی کہہ چکا تھا۔ غور کیا تو ایک جال سا بچھا ہوا نظر آیا۔ ریل کو تو پہچان لیا مگر اور کئی سواریاں — کیا برق رفتار نظر آئیں اور کیا کیا کلیں کہ دیکھ کر اچنبھا ہو۔ مگر دانایانِ فرنگ سے کچھ بعید نہیں۔ میدان بھی خوب دکھائی دیئے کھیل تماشے بھی کیا کیا عجوبہ نکلے ہیں۔ ایک جگہ تو کیبو نظر آیا۔ حد نظر تک چمنیاں، وہ کنگرا والی لمبی چوڑی سڑک، رات کی روشنیاں — گویا ایک بازار چراغاں تھا سر بسر۔ کبھی قاہرہ کا جمال دکھائی دیا۔ ہائے وہ یاد کہن!"

مجھے اب یہ جاننے کی ضرورت نہ تھی کہ یہ "خضر کی صورت" والے بزرگ کون تھے۔ حضرت غالب کی معیت میں میں آگے ہی بڑھتا رہا کہنے لگے: "ہم نے تو اس دنیا کا بس دور ہی سے نظارہ کیا ہے۔ جی چاہے ہے کہ نزدیک سے بھی دیکھوں۔ تم یہاں کافی عرصہ سے رہتے ہو، ضرور کچھ بتاؤ گے کہ کون کونسے مقامات دیکھنے چاہئیں"۔

عرض کیا "قبلہ بجا ارشاد ہے۔ مگر یہ تو فرمایئے کس کس جگہ کی سیر کا شوق زیادہ ہے۔ یہاں تفریح کا کیا ٹھکانہ۔ سیر کی جگہوں کی کمی نہیں۔ ادبی شوق ہو تو دار المطالعہ جگہ جگہ موجود ہیں۔ عجائب خانہ بھی ہے، مگر پہلے میرے غریب خانہ پر تشریف لے چلیں تو عین کرم ہو"۔

معاملہ طے ہو گیا اور میں حضرت کو لے کر اس پرانی فورڈ میں آن بیٹھا۔ چند میل کی مسافت کے بعد گھر آ گیا۔ دروازہ کھولا اور حضرت کو اندر لے گیا۔ فرمانے لگے "ہاں میاں تم نے کہا تھا کسی نے میری غزلیں گائی ہیں۔ ہاں وہ کیا چیز ہوتی ہے ریکارڈ؟ تو انہیں سنواؤ نا جو فردوس گوش بھی میسر ہو۔ کیا یہ ریکارڈ سنائے گی؟"

میں مسکرایا۔ "نہیں حضور، سہو ہوا یہ تو ٹائپ رائٹر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل پھر عرض کروں گا۔ سرِ دست یہ ارشاد ہو کہ آپ پئیں گے کیا! چائے یا کافی؟"

"بھئی پینے کی جو بھی چیز ہو پی لیتا ہوں۔ تم جب ساقی گری کی شرم کرو گے تو مجھے بھلا کیا عذر ہو گا"۔

میں سمجھ گیا کہ میاں کچھ نہیں سمجھے اور اپنے ذہنی مشروب کا خود ہی سُرور لیتے رہے اور جب میں نے جگ بھر کر کافی سامنے رکھ دی اور حضرت نے چسکی لینی شروع کی تو گویا ہوئے "بھئی شئے عجیب معلوم ہوتی ہے۔ مگر کیا خاک مزا ہے۔ تم ہی اس کا کچھ لطف اٹھاتے ہو گے کوئی ایسا شغل نہیں کرتے کہ یک گونہ بیخودی کا موجب بنے؟"

دست بستہ عرض کیا "حضور میں تو نرا زاہدِ خشک ہوں"۔

"تو میاں پھر اپنے کو کیوں زندوں میں شمار کرتے ہو؟"

"بس جئے جا رہے ہیں۔ ویسے بپاسِ خاطر والا نزدیک کے ہوٹل میں چلتا ہوں۔ تشریف لائیے اور عہد نو کے خانۂ سُرور کو بھی دیکھئے۔ مگر ایک عرض ہے۔ یہ مقام ایسا ہے کہ جب تک یہاں کی وضع و قماش اختیار نہ کی جائے محفل کا لطف زیادہ نہ اٹھایا جائے گا۔ لوگ اجنبی سمجھیں گے، دور دور رہیں گے، تماشہ بن جائیں گے"۔

"ہاں بھئی یہ تو ٹھیک ہے، جیسا دیس ویسا بھیس۔ تو پھر کیا تجویز ہے؟"

"تجویز یہ کہ آپ میرا ایک سوٹ پہن لیں اسے پہن کر ادھر چلیئے"۔

چنانچہ انہیں مغربی لباس پہنا دیا گیا۔ گھر سے نکل کر "نچری" اور "ایوشیبن" کے سنگم پر "حیات ہاؤس" کو انتخاب کیا۔ اس کا مالک کوئی ایرانی معلوم ہوتا تھا۔ یہ جگہ تھی بھی خوب۔ خواتین کا رنگین ہجوم، لباس میں ہر درجہ اختصار، نیم تاریک ایوانِ رقص۔ ہر کوئی ایک دوسرے

سے بے پروا اپنی ہی دھن میں مست، کبھی اپنے سے بھی بے خبر۔ اور اُدھر ساقی بجلوۂ "دشمن ایمان و آگہی" موجود تو ادھر مطرب بہ نغمۂ "رہزن تمکین و ہوش" بھی۔ ڈھلتی دوپہر سے جو بزم نشاط مرتب ہوتی ہے تو تاروں کے آخری جھلملانے تک برپا رہتی ہے۔ جو آتا ہے ایک خاص انداز دلربائی سے اور دیکھنے والوں کے دامانِ ہوش تار تار!

بہرکیف ہم بلاکشانِ محبت اس مقام تک پہنچ ہی گئے۔ بیٹھتے ہی حضرت بولے "میاں زبانِ فرنگ میں اس کی انواع و اقسام کو کیا کیا کہتے ہیں، یہ تو تم جانو۔ مگر کہو: لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے لا اور جلد لا۔ اب یہاں پہنچ کر تاب و تواں رخصت ہوا چاہتے ہیں۔"

"ابھی لیجیے، حضرت۔"

ہمارے بیٹھتے ہی ایک حور اضی کھٹ کھٹ کرتی، ہاتھ میں کاغذ قلم تھامے آن پہنچی۔ اس نے بھی لباس کا زیادہ تکلف مناسب نہیں سمجھا تھا۔ کہنے لگی "کیا خدمت کی جائے؟"

میں نے عرض کیا "کوئی بھی سرور آور شے لے آؤ۔"

"مگر کیا، ہوسکی، برانڈی، مارٹینی۔ رم۔ جن؟"

حضرت نے اس کے سراپا کا جائزہ لینے کے بعد فرمایا "بھئی خوب خوب نام ہیں۔ میں تو رم کو رم آہو سے پہچانا اور یہ جن بھوت بھلا کیا شراب ہوگی، ہم تو اولڈ ٹام پسند کرتے تھے۔ خالص انگریزی شے تھی، مگر اب نیا زمانہ ہے، جو بھی آ جائے۔"

"حضرت نام میں کیا رکھا ہے۔ میں تو اتنی ہی معلومات رکھتا ہوں کہ ان کے چند نام آتے ہیں۔ یوں اس ساقی کو سمجھانے کے لئے اتنا کہہ دیتا ہوں کہ جو بھی لاؤ تیز عمل شے ہو۔" چنانچہ اس ہی طرح کہہ دیا۔

کچھ دیر شغل رہا۔ سرور گھٹنے لگا تو حضرت بولے "میاں اس جلوہ گر کو تو بلاؤ۔ کیا ہم اسے بلا سکتے ہیں؟"

"کیوں؟ کیا کوئی خاص بات کہنی ہے؟"

"میاں تم بھی عجب تماشہ ہو۔ اپنے آپ کو زندوں میں شمار کرتے ہو۔ نہ پیتے ہو نہ کافر اداؤں کی داد دیتے ہو۔"

عرض کیا "حضرت آپ کا پیشہ تو سو پشت سے سپہ گری رہا ہے۔ میں نے بھی اس شعار کو اختیار کیا اور بڑی پابندی سے کیا۔ بلکہ اب تو زندگی کا جزو ہو گیا ہے۔ مگر یہ جرات آپ نے کبھی اس کی بابت آپ ہی کی بات دہرا دوں۔ کچھ طبیعت ادھر نہیں آتی۔ خوف یہ ہے کہ چھوٹے میری ان حرکتوں سے کیا سبق لیں گے اور بڑے سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ غرض ان اندیشہ ہائے دور و دراز میں عمر کٹ گئی۔"

"میاں ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے کہ مولوی صدر الصدور بنے جا رہے ہو۔ کچھ تو فریب آرزو دکھاؤ کہ زیست کا مزا پاؤ۔"

"خوب ارشاد ہوا۔" میں نے مسکرا کر داد دی۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک اور تمثالِ خوبی اُدھر آ نکلی۔ اس نے ساقی گری کی شرم رکھ لی اور حضرت کو جام بھر کر پیش کر ہی دیا۔ مسکرائی اور ادائے خاص سے لچکتی مچلتی جس تیزی کے ساتھ ادھر آئی تھی اسی تیزی سے نکل کر ایک دوسری میز کی طرف بڑھ گئی۔ حضرت کا سرور اوج پر تھا اور مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے:

"بھئی بڑا لطف رہا۔ مگر اب کہیں اور چلنا چاہیے۔ آدمی کو شہد کی مکھی بننا چاہیے۔ کہیں اور چل کر کسی اور جلوہ گاہ کی سیر کریں۔ کسی اور کے ہاتھ سے جام پئیں، سرور سے سرور پیدا ہو، قند مکرر کا مزا آئے۔" مگر میں نے بات کاٹ کر کہا حضور آپ ہی تو فرما گئے ہیں۔

"ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے"

اس پر حضرت پھر کچھ مسکرائے اور کہنے لگے "ہاں یہ بھی ٹھیک ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھئے کہ

بے مے کسے ہے طاقت آشوب آگہی
کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایاغ کا"

میں نے عرض کیا "جہاں تک پینے پلانے کے مسئلہ کا تعلق ہے کون کافر ہے جو آپ کی بات رد کرے۔ چلئے کہیں اور چلتے ہیں۔"

یہ کہہ کر ہم باہر آئے اور ائیرپورٹ کی دوسری جانب "میفلاور" نامی میخانے میں پہنچے۔ یہاں بھی وہی عالم۔ نیم تاریک ایوان رقص و سرود مگر بدلا ہوا انداز، تیز تیز موسیقی اور مغربی رقص کی ساری کا فرما جرا جلی و خفی حقیقتیں سامنے تھیں۔

اگلے وقتوں کی وضع پر بنی ہوئی برقی شمعیں روشن تھیں۔ مگر افسوس! پروانہ تھا نہ پتنگا، بس ایک شمع ہی رہ گئی تھی سو وہ بھی نیم سوختہ۔ اور جام بھی وہی مانوس مانوس ناموں کے تھے۔ برتن، اولڈ کرو، سکاچ، مارٹینی، ٹکی لارج، شلر، اولمپک غرض ہر قسم کی

بیئر بھی موجود۔ وہ چھلکتے جام اور آنکھوں کے تن کہے مگر خوب سمجھے جانے والے پیغامات ہر قدم پہ، ہر طرف قہقہہ، ہر جانب سرگوشیاں، کن انکھیوں کے اشارے، مسکراہٹیں — اسے جنت ارضی کہنے میں کسے باک ہوگا؟ جو خود سُرور کے جنگل میں تھے وہ تو خیر تھے ہی، جو صرف انہیں دیکھ ہی رہے تھے وہ بھی کم مگن نہ تھے۔ جولانی، امنگ، رقص، لوک جھونک، تراوت، سادگی، پُرکاری — کیا کیا نہ تھا۔ "چا چا" اور "ٹوسٹ" کی موسیقی کے درمیان زلفوں کا گھنیرا اندھیرا — نیم سوختہ شمعیں۔

سوچتا تھا "منزلِ دل بھٹکے گا"۔ مگر خیر دامن کشاں ایک طرف "گوشہ عافیت" میسر آ ہی گیا اور ہم بیٹھے ہی تھے کہ "آداب" کرتی اور "کار لائق" دریافت کرتی ہوئی ایک جلوہ فروش "چاچا رقص" کرتی ایک لڑکی کے ساتھ تیرتی ہوئی ہمارے قریب آ پہنچی۔ بڑھتا ہوا اندھیرا، بڑھتی ہوئی ہماہمی، تیز رفتار موسیقی، ہلکے سُروں پر رقص کرنے والوں کا کبھی قریب آنا، کبھی دور چلے جانا — عجب سماں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ محفل ہاؤ ہو، شب کو ایک بجے سے پہلے ختم ہونے والی نہیں — اور اب وہ لمحہ بھی آ پہنچا تھا یعنی وداعِ جلوہ کی ساعت قریب تھی اور "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا" بنا دینے والا اعلان بھی ہونے لگا۔ بساطِ ہوائے دل الٹنے لگی اور ہم بادلِ محزوں باہر آئے۔

•

دوسرے روز صبح تقریباً نو بجے بیدار ہوا۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر شہر کا رخ کیا۔ وہی "ڈاؤن ٹاؤن" گویا اپنے علاقے صدر کی طرف نکل گئے۔ ہر شخص رواں دواں، زندگی کے دھارے پہ بہے چلا جا رہا تھا۔ تیز رفتاری، بڑے بڑے اسٹور، عالیشان عمارتیں۔ ہر قوم، نسل، رنگ، عمر اور وضع داد کی خواتین کا ہجوم۔ رومانی جوڑے بھی نظر آئے، دنیا و مافیہا سے بے خبر، ہاتھ میں ہاتھ دیئے چلے جا رہے تھے، کوئی دیکھتا تو وہ مسکرا دیتے۔ حضرت بھی ہم رکاب تھے۔ یہ سب کچھ دیکھتے چلے جا رہے تھے کہ ان سے رہا نہ گیا اور فرمانے لگے "عجب زندہ دل لوگ ہیں۔ دل پھینک۔ مگر تم نے اس میدان کی کتنی سیر کی؟"

عرض کیا "مجھے اس دنیا سے علاقہ نہ رہا۔ وہی آپ کی بات:

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

اصل میں میں اس راہ پر آیا ہی نہیں"

"تو میاں پھر دعا کرو کہ یونہی دکھ کسی کو دیا نہیں خوب ورنہ

کہتا کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی!"

اس پر میں اور تو کچھ نہیں مگر ہاں اتنا ضرور کہہ سکا "خدا اس دعا کو قبول کرے!" یہ بات ابھی ختم ہی ہوتی تھی کہ پھر ایک پیکرِ خوبی سامنے نظر آئی۔ لباس کے اختصار کا وہی عالم۔ حضرت بول پڑے:

"مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے نقاب"

"لیکن حضرت! شوق کو یاں اجازت تسلیم و ہوش تو ممکن نہیں!"

اس پر خوب ہنسے اور یونہی راستہ کٹتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں بارش ہونے لگی۔ ایک دم تیز ہوا چلنے لگی اور ایسا لگا جیسے کسی جھکڑ نے مجھے اٹھا کر دیوار سے ٹکرا دیا ہے!

مگر یکدم چونکا۔ غور کیا تو معلوم ہوا یہ سب عالم رویا تھا، ایک خواب تھا حقیقت نما۔

ٹیبل پر رکھا ہوا پانی کا گلاس گر کر ٹوٹ چکا تھا۔ پانی نے کتابوں، کاغذوں کو شرابور کر دیا تھا اور یہ سیل بے محابا اب میرے ہاتھوں تک آ پہنچا تھا! ٭

"ستارۂ سحری"*

(اسلام آباد)

سلیم خاں گمی

اقبالؔ نے کہا تھا: "کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد"

مگر آج پاکستان میں ایک نہیں، کئی تازہ بستیاں زیرِ تعمیر ہیں اور "آباد و شاد" کے عمل کا تسلسل وجہ طمانیت ہی نہیں حیرانی کا سبب بھی ہے۔ قلب و نظر اِن معنوں میں حیران ہیں کہ ایک قوم اتنے مختصر سے عرصہ میں تعمیر و آبادی کے اتنے کٹھن مرحلے کیسے طے کر گئی اور کر رہی ہے۔ حقیقت ہے کہ اب پاکستان میں تازہ بستیاں آباد کرنے والے اہلِ نظر کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ پریشانیاں جو دیدہ و دل کو پابندِ نالہ کئے ہوئے تھیں ۱۹۵۸ء کے انقلابِ زریں میں ختم ہو گئیں۔ وقت نئی اور حوصلہ افزا بشارتیں لے کر آیا۔ انقلاب کے چار سال بعد آج بشارتیں سچائی کے نور سے فروزاں ہیں اور انہیں ایک دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر دنگ ہے۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

انقلاب کی مسرت افزا بشارتوں میں سے ایک بشارت قومی دارالحکومت کے قیام و تعمیر کی بھی تھی۔ آج یہ بشارت اسلام آباد کے روپ میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اگر بستی آباد کرنے والے اہلِ نظر کہلا سکتے ہیں تو تازہ شہر آباد کرنے والوں کو قوم کس طرح یاد کرے گی؟ قوم انھیں اہلِ نظر، اہلِ ایماں اور اہلِ ہمت کہہ سکتی ہے۔ صدرِ پاکستان محمد ایوب خاں اور ان کے رفقا یقیناً ان تینوں خوبیوں بلکہ تصوف کی زبان میں، ان تینوں "کیفیتوں" کے مالک ہیں۔ یقیناً ان خوبیوں اور کیفیتوں کے بغیر اسلام آباد کی تعمیر و تکمیل ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔

اصل میں اسلام آباد ہماری نئی ثقافت کا مظہر ہے۔ ایک مظہرِ جمیل۔ یہ نئی ثقافت توانا بھی ہے اور اسلامی بھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح اسلام آباد کے معمار قلبِ مومن بھی رکھتے ہیں اور عہدِ جدید کے تقاضوں کے رمز شناس بھی ہیں۔ اس دعوٰی کی تصدیق ہر وہ شخص کرے گا جو اسلام آباد کی تعمیر و تکمیل کے مرحلے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور ان دیکھنے والوں میں اعلیحضرت شہنشاہ ایران اور فرمانروائے اعلیٰ ملایا جیسی ہستیاں بھی ہیں اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے کسان اور طالب علم بھی۔

اسلام آباد خطۂ پوٹھوہار کے عین قلب میں واقع ہے۔ پوٹھوہار پاکستان کا وہ خطہ ہے جو صدیوں تک نئی اور پرانی تہذیبوں کا وارث، امین اور جولاں گاہ رہا ہے۔ اس خطے میں برف کے عہد کی ثقافت، پتھر اور دھات کے زمانے کے آثار، گیا ہستانی ثقافت اور کول، دراوڑ، آریائی، ایرانی، یونانی، باختری، منگول، سیتھین غرض کوئی بیس ثقافتیں اپنے اپنے عہد میں پروان چڑھیں۔ آج یہی خطہ پاکستان کی اسلامی ثقافت کا مرکز ہے اور اسلام آباد اس خطہ کا مینو سواد اور آج شام و سحر تعمیر و تکمیل کے مرحلوں سے گزر رہا ہے۔

پاکستان کے لئے نئے قومی دارالحکومت کی ضرورت آزادی کے حصول کے ساتھ ہی محسوس ہو چکی تھی مگر اِس انقلاب سے پہلے اس احساس کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ نیم دلی کے ساتھ کوششیں ہوئیں مگر نیم دلی سے کبھی کوئی کام سرانجام نہیں پا سکتا۔ ماڑی پور، گڈپ اور ملیر کے مقامات کو قومی دارالحکومت کے لئے چنا گیا مگر تعمیر کا مرحلہ کبھی نہ آیا۔ کراچی کے ساحلی شہر میں بکھری ہوئی عمارتوں میں مرکزی حکومت کے دفاتر قائم ہوئے، اور کام کرتے رہے مگر ان دفاتر کی عارضی عمارتوں سے چھٹکارا حاصل نہ ہو سکا۔ آخر اکتوبر ۱۹۵۸ء میں انقلاب آیا تو نئے عزم اور نئی ہمت کے چراغ بھی روشن ہوئے۔ مردہ دلی اور پراگندہ خیالی کے اندھیرے دور ہوئے، اور اس طرح وطن تعمیر و ترقی کے ایک فیصلہ کن دور میں داخل ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ صدر ایوب نے ہی قومی دارالحکومت کے اس منصوبہ کی طرف پوری طرح توجہ دی جو دس سال سے گومگو کی حالت میں چلا آ رہا تھا۔ اس مسئلہ کا جائزہ لینے کے لئے فروری ۱۹۵۹ء میں آٹھ افراد پر مشتمل ایک کمیشن قائم ہوا جس کے چیئرمین میجر جنرل اے۔ ایم۔ یحییٰ خاں تھے۔ کمیشن کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ قومی دارالحکومت کی حیثیت سے کراچی کی موزونیت پر غور کرے اور اگر کراچی قومی دارالحکومت کے لئے موزوں نہ ہو تو کسی دوسری

* "ستارۂ سحری مژدۂ صبح دیدارے ست" (غالب)

جگہ کی بابت غور کرے۔ کمیشن نے چار ماہ کے کافی غور و فکر کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی کہ کراچی صنعتی و تجارتی اعتبار سے تو موزوں شہر ہے مگر قومی دارالحکومت کے تقاضے پورا کرنے سے قاصر ہے۔ کمیشن نے یہ بھی کہا کہ پاکستان کا کوئی بھی شہر قومی دارالحکومت بننے کے لئے موزوں نہیں ہے۔ چنانچہ کمیشن نے فیصلہ کیا کہ نیا وفاقی دارالحکومت الگ ہی تعمیر کیا جائے۔ اس غرض کے لئے راولپنڈی کے شمال اور شمال مشرق میں اسلام آباد کے رقبہ کو منتخب کیا گیا کیونکہ یہ رقبہ آب و ہوا، پیداوار، قدرتی وسائل، دفاع اور مواصلات کے اعتبار سے بھی پاکستان کا موزوں ترین علاقہ تھا جو اس مقصد کے لئے موزوں ہو سکتا تھا۔

لیجئے اب کچھ حال اس مقام کا بھی سن لیجئے۔ اسلام آباد کا رقبہ ڈھائی سو مربع میل کو محیط ہے۔ اس رقبہ کی سطح سمندر سے ڈیڑھ ہزار فٹ سے دو ہزار فٹ تک بلند ہے۔ اس کے شمال میں مرگلہ کی پہاڑیاں، شمال مشرق میں مری کی پہاڑیاں، جنوب مغرب میں شاہراہ اعظم اور جنوب میں اہترا کہ روڈ واقع ہیں۔ آب و ہوا بڑی خوشگوار ہے۔ زیادہ سے زیادہ اوسط درجۂ حرارت ایک سو تین اور کم سے کم اوسط درجۂ حرارت اڑتیس درجے رہتا ہے۔ اسلام آباد کے رقبہ میں چار دریا — سواں، کورنگ، لنگ اور کس — بہتے ہیں۔ مرگلہ اور مری کی پہاڑیوں میں چشموں، آبشاروں اور جھرنوں کی کوئی کمی نہیں۔ یہاں تعمیراتی سامان بھی بخوبی مل جاتا ہے۔ ہر قسم کی سبزیاں، ترکاریاں بافراط ہیں۔ اشیائے خورونوش بافراط دستیاب ہوتی ہیں۔ غرضیکہ اسلام آباد کے علاقہ میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو کسی قومی دارالحکومت کے لئے ضروری سمجھے جا سکتے ہیں۔

جون ۱۹۵۹ء میں صدارتی حکومت نے اسلام آباد کے رقبہ کو وفاقی دارالحکومت کے لئے موزوں قرار دئے جانے کی رپورٹ منظور کی اور اس کے بعد ستمبر ۱۹۵۹ء میں "فیڈرل کیپیٹل کمیشن" کے نام سے ایک ادارہ قائم کر دیا گیا۔ اس کمیشن نے اسلام آباد کے لئے "عظیم منصوبہ" اور "عظیم لائحۂ عمل" تیار کیا۔ اس غرض کے لئے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے ایک سو ماہرین نے باہم مل کر کام کیا۔ یہ ماہرین مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے چھیالیس محکموں سے لئے گئے تھے، اور چودہ کمیٹیوں میں تقسیم ہو کر الگ الگ اپنے کاموں کو مکمل کر رہے تھے۔ ان کمیٹیوں نے اسلام آباد کی تعمیر و تکمیل کے ہر پہلو پر ماہرانہ انداز میں اور بڑی تفصیل کے ساتھ غور کیا اور اپنی رپورٹیں پیش کر کے کام کو آگے بڑھایا۔

فروری ۱۹۶۰ء میں وفاقی دارالحکومت کے رقبہ کو اسلام آباد کا مبارک نام عطا کیا گیا۔ اور اسی سال ہی میں کمیشن نے ابتدائی عظیم منصوبہ تیار کیا جس پر صدارتی کابینہ کے اجلاس میں سوچ بچار کیا گیا۔ اس اجلاس کو اس اعتبار سے تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ یہ اسلام آباد کی پہاڑیوں، شکر پڑیاں پر منعقد ہوا تھا، یعنی تعمیر نو کی شروعات ہوئی۔

یوں اسلام آباد کی تعمیر دس سال میں مکمل ہوگی۔ مگر تعمیری مرحلوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے پنجسالہ منصوبہ (۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۵ء تک) کے مقاصد حسب ذیل رکھے گئے ہیں۔

(۱) پچیس ہزار ایکڑ اراضی کا حصول (۲) چھ ہزار سرکاری ملازموں کے لئے مکانات (۳) چھ ہزار سرکاری ملازموں کے لئے دفاتر (۴) دو سو بیس کمروں پر مشتمل پاکستان ہاؤس کی تعمیر (۵) اٹھانوے میل لمبی سڑکوں اور راستوں کی تعمیر و پختگی (۶) پچاس ہزار نفوس کی آبادی کے لئے آب رسانی (۷) پچاس ہزار کی آبادی کے مکانوں اور دوکانوں اور دفتروں کی آب نکاسی (۸) اٹھارہ ہزار ایک سو پچاس ایکڑ اراضی کی تزئین اور شجرکاری (۹) ایوانِ صدر، سپریم کورٹ اور پارلیمنٹ کی تعمیر (۱۰) سفارتی بستی کے دو سو ایکڑوں کی ترقی (۱۱) ساٹھ ایکڑ کے رقبہ میں چھوٹی صنعتوں کی تنصیب (۱۲) تعلیمی اور رفاہی اداروں (مدرسے، ڈاک خانے وغیرہ) کی تعمیر (۱۳) بجلی کی فراہمی (۱۴) اسلام آباد کے رقبہ کے کاشتکاروں اور زمینداروں کی متبادل آبادکاری۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۵ء تک کے پنجسالہ منصوبہ پلان دو سالوں، ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک میں جو کام ہوئے ہیں ان کا اجمالی ذکر بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔

اسلام آباد کے لئے اراضی حاصل کی جا چکی ہے۔ سرکاری ملازموں کی رہائش کے لئے چھ سو مکان بن کر تیار ہو چکے ہیں۔ چھ سو مکانوں کی اس بستی کو "آب پارہ" کا نام دیا گیا ہے۔ آب پارہ میں بجلی اور پانی کا نظام مکمل ہے۔ یہاں تار گھر اور ڈاک خانہ کام کر رہے ہیں۔ اس بستی کی آٹھ دوکانیں بھی تعمیر ہو چکی ہیں۔ محکمہ امداد باہمی نے اپنا سٹور یہاں قائم کیا ہے اور محکمہ صحت کی طرف سے شفاخانہ بھی موجود ہے۔ بچوں کے لئے سکول اور پارکوں کا اہتمام ہو چکا ہے۔ غرض آب پارہ میں زندگی کی ہر آسائش فراہم ہو چکی ہے۔ ایک ہزار چار سو پندرہ مکانوں کی تعمیر عنقریب مکمل ہو جائیگی۔

سرکاری ملازموں کے لئے دفاتر کی منصوبہ بندی جاری ہے "پاکستان ہاؤس" کی تعمیر کے علاوہ اور ایک اعلیٰ درجہ کے ہوٹل کی تعمیر بھی جلد مکمل ہو جائے گی۔ اس ہوٹل کا رقبہ تقریباً ساٹھ ہزار مربع گز ہوگا۔ اس کی پانچ منزلیں رکھی گئی ہیں جن میں سے تین منزلیں تعمیر بھی ہو چکی ہیں اور چوتھی منزل کا کام جاری ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو اس عمارت کی چھٹی منزل بھی تعمیر کی جائیگی۔

سڑکوں کی تعمیر کے لئے زمین ہموار ہو رہی ہے "نیشنل پارک روڈ" پر کام مکمل ہو چکا ہے۔ دریائے کورنگ پر پل کی تعمیر ۱۹۶۳ء میں مکمل ہو جائے گی۔ اسلام آباد میں چار بڑے پل بھی ہوں گے جن میں سے ایک دریائے کورنگ کا پل ہوگا۔ مرگلہ جیب روڈ پر بھی کام ہو رہا ہے اور اب تک اس سڑک کے بیس میل مکمل ہو چکے ہیں۔ آبپارہ کے گلی کوچوں، راستوں اور ملحقہ سڑکوں پر جو کام ہو رہا ہے اس کے جلد مکمل ہو جانے کی توقع ہے۔

سید پور اور نور پور شاہاں کے آبی ذخیرے یہاں کا خاص ہر آ ہیں جن سے کام لیا جائے گا۔ شکر پڑیاں کی پہاڑی پر جو آبی ذخیرہ زیر تعمیر ہے وہ تکمیل کو پہنچنے والا ہے۔ چنانچہ اس آبی ذخیرہ میں ساڑھے چار لاکھ گیلن پانی جمع رہے گا اور اسلام آباد کے بعض ذیلی حلقوں میں پائپ لائنیں بچھائی جا رہی ہیں، اس طرح ہر جگہ صحت بخش پانی پہنچ سکے گا۔

اسلام آباد کی تزئین اور شجر کاری پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ جاپان کے ایک ماہر کیمو کونڈو، نے "نیشنل سپورٹس سینٹر" کی تعمیر، تزئین اور منظر طرازی کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں کھیل کے میدان، بچوں اور عورتوں کے لئے پارک، گولف کے میدان ہوں گے۔ ایک مصنوعی جھیل، چمن زار اور کشتی رانی کے کلبوں کے لئے بھی خاکے تیار کئے گئے ہیں۔ شکر پڑیاں کی پہاڑی پر مجوزہ باغوں کے لئے زمین ہموار کر لی گئی ہے۔ جس جگہ پر صدر ایوب اور ان کی کابینہ نے اسلام آباد کے ابتدائی عظیم منصوبہ پر غور و خوض کیا تھا وہ جگہ اب ایک تاریخی اہمیت اختیار کر گئی ہے اور اب وہاں پھول کھلتے نظر آتے ہیں۔ اس پہاڑی کے ایک سو ایکڑ رقبہ پر شجر کاری کا کام ختم ہو چکا ہے۔ اب تک پانچ ہزار آٹھ سو ستر ایکڑ رقبہ میں پودے لگائے جا چکے ہیں۔ اسلام آباد میں اس وقت دو لاکھ پودے بالکل تیار ہیں۔ اسلام آباد کے جس پودگھر سے پودے لئے جاتے ہیں وہ خود کافی بڑا ہے یعنی تیس ایکڑ رقبہ میں پھیلا ہوا ہے اور اس میں ایک لاکھ اور پودے شجر کاری کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ راول جھیل، پرانی مری روڈ اور ملحقہ راستوں پر بھی باغ لگائے جائیں گے، چنانچہ اس غرض کے لئے زمین ہموار ہو رہی ہے اور یہ جگہ عنقریب لالہ زار بن جائے گی۔

ایوانِ صدر، سپریم کورٹ اور پارلیمنٹ کی عمارتیں انتظامی حلقہ (سیکٹر) میں ہوں گی۔ ان عمارتوں کے علاوہ اسی حلقہ میں ثقافتی اہمیت کی عمارات جیسے قومی کتب خانہ، قومی عجائب گھر اور سیکرٹریٹ کی عمارتیں بھی ہوں گی۔ ان عمارتوں کی منصوبہ بندی پر بیرونی ممالک کے کئی ماہروں سے بھی مشورہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض عمارتوں کی منصوبہ بندی کا کام مکمل ہو گیا ہے اور تعمیر کا سلسلہ عنقریب شروع ہونے والا ہے۔

یہاں ایک سفارتی علاقہ بھی ہوگا۔ اُس علاقہ میں سے دو لاکھ اڑسٹھ ہزار نو سو بہتر اعشاریہ تراسی مربع گز رقبہ پٹے پر دیا بھی جا چکا ہے۔ اب تک آسٹریلیا، سویڈن، برطانیہ، ہندوستان، اٹلی، برما، فرانس، آسٹریا اور نیدرلینڈ کے سفارت خانے یا قونصل خانے اپنے اپنے لئے زمینیں لے چکے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اس زمین سے "کیپٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی" کو ترپن لاکھ اناسی ہزار چار سو چھپن روپے کی رقم وصول ہوگی۔

فلاح عامہ کے کاموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، اور چھوٹی صنعتوں کی تنصیب کے لئے اب تک انیس پلاٹ الاٹ کئے گئے ہیں۔ صنعت کاروں نے اپنے کارخانوں کے لئے تعمیر کا کام شروع کر دیا ہے سیمنٹ تیار کرنے اور پتھر کوٹنے کے کارخانے قائم بھی ہو چکے ہیں۔

تعلیمی اور رفاہی اداروں کی تعمیر کا منصوبہ منظور ہو چکا ہے۔ جس کے تحت اس وقت چار پرائمری سکولوں کی عمارتیں بن رہی ہیں۔ حکومت مغربی پاکستان راولپنڈی اور اسلام آباد کے درمیان ایک ڈگری کالج بھی قائم کرے گی جس کی تعمیر جاری ہے۔ اسی طرح پارکوں، ڈاک خانوں، تار گھروں، کلبوں، کھیل کے میدانوں تھانوں اور کینٹینوں کی تعمیر بھی مختلف مراحل سے گزر رہی ہے۔

برقی قوت کی فراہمی کے سلسلے میں جو کام ہوا ہے وہ بھی بڑا ہمت افزا ہے۔ چنانچہ اس وقت اسلام آباد میں ایک سو بتیس کلوواٹ کا بجلی گھر قائم کیا جا رہا ہے جس پر اسی فی صد کام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ بجلی گھر واپڈا کے

کاموں کا سلسلہ ہے۔ اسلام آباد کے شہر کو مستقل طور پر بجلی فراہم کرنے کے لئے جو انتظامات کئے جا رہے ہیں ان پر واپڈا کے افسروں اور کارپردازوں سے بات چیت کا سلسلہ جاری ہے۔ توقع ہے کہ اسلام آباد کو بجلی فراہم کرنے کے مستقل ذریعوں کی تعمیر کا کام عنقریب شروع ہو جائیگا۔

"کیپیٹل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی" کے افسروں اور کارکنوں نے اسلام آباد کے کسانوں، کاشتکاروں اور زمینداروں کی متبادل آبادکاری کی طرف بھی پوری توجہ دی ہے اور اب تک آٹھ سو بتیس کنبوں کو ضلع منٹگمری کے ساڑھے گیارہ ہزار ایکڑ رقبہ میں آباد کیا جا چکا ہے۔ کیپیٹل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی کی کوششوں کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ مغربی پاکستان کی صوبائی حکومت نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اسلام آباد کے کسانوں اور زمینداروں کو ضلع منٹگمری میں مزید بیس ہزار ایکڑ رقبہ فراہم کرے گی، اسکے علاوہ صوبائی حکومت نے گدو بیراج میں سے ساٹھ ہزار ایکڑ رقبہ دینے کا بھی وعدہ کیا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق اسلام آباد کے کسانوں اور زمینداروں کو اس زمین سے زیادہ مزروعہ رقبہ دیا جا رہا ہے جو وہ اسلام آباد میں چھوڑ رہے ہیں۔ اس لئے کسی کو شکایت کا موقع ہی نہ رہے گا۔

ان سطور میں اسلام آباد کی تعمیر کے صرف پہلے دو سالوں کا ہی جائزہ لیا گیا ہے اور وہ بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں ہے۔ مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ ہم اس سلسلہ میں کتنا سفر طے کر چکے ہیں۔ اسلام آباد کے پہلے دو سالوں میں منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ تعمیرِ اسلام آباد کے ذمہ داروں اور کارکنوں کو یہ بھی احساس ہے کہ وقت ضائع نہ ہونے دیں۔ لیکن تعمیر کے ابتدائی مرحلوں میں اس خیال کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے کہ منصوبہ بندی میں نقص بھی نہ رہے۔ ان باتوں کے باوصف ان دو سال میں بھی جو زبردست تعمیراتی کام ہوا ہے وہ اسلام آباد کو صرف ایک نظر دیکھنے والے فوراً محسوس کر لیتے ہیں اور آنے والی بہار کا قیاس کر سکتے ہیں۔

غرض مرگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں عزم و ہمت کی ایک نئی داستان تحریر کی جا رہی ہے۔ نہ صرف انجینئروں، کاریگروں، ٹھیکیداروں اور مزدوروں کے چہروں اور ہاتھوں پر عزم و ہمت، ولولہ و شوق اور بے پناہ مصروفیت کی چمک دیکھی جا سکتی ہے، امید ہے اسلام آباد کی تعمیر کی داستان ہماری موجودہ نسل اور آئندہ نسلوں کی ثقافتی ترقی کی داستان ہوگی جس پر ہم فخر کر سکیں گے۔

★

غالب: دو شعر، دو ستارے بقیہ صفحہ ۸

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

یعنی دنیا بھر کی تمنائیں ایک حرف میں سما سکتی ہیں، مگر میں حضوری کی لذت میں داستان کو طول دیتا گیا کہ جب تک عرض کرتا جاؤں گا، حضوری حاصل رہے گی۔ ظاہر ہے کہ داستان کی لذت کے بجائے "ذوقِ حضوری" کو طولِ کلام کا مدار قرار دینا بدرجہا زیادہ معقول اور دلکش ہے۔

اس سلسلے میں عرفی کا ایک شعر اور بھی سن لیجیے، کہتا ہے: ؎

تمام بود بہ یک "حرفِ گرم" و ما غافل
حکایتے کہ ہمہ ناتمام می گفتند

یعنی جو حکایت سب سناتے رہے، مگر اسے پورا نہ کر سکے، حقیقتِ حال کے اعتبار سے وہ ایک "حرفِ گرم" میں پوری کی جا سکتی تھی، لیکن ہم غفلت کے باعث یہ راز پا نہ سکے۔ "حرفِ گرم" صرف عرفی کہہ سکتا تھا اور عشق و عمل کا کون سا پہلو ہے، جو اس حرف میں مضمر نہیں؟

★

غزل

تابش دہلوی

خود کو ہم اور بھی شرمندۂ احساں کر لیں
وہ جو پوچھیں، تو بہت حال پریشاں کر لیں

اپنی تسکیں کے لئے دل بھی جلا کر دیکھیں
لاؤ یہ شمع بھی ہم آج فروزاں کر لیں

جانفزا نیم نظر بھی نگہِ لطف بھی ہے
کون سے تیر کو پیوستِ رگِ جاں کر لیں

تیری تنویرِ جبیں، تیرا تبسم کہہ کر
ہم مقرر کوئی مفہومِ بہاراں کر لیں

ہر نئے چاک میں اک بابِ چمن کھلتا ہے
پیرہن ہی میں نہ کیوں لاکھ گریباں کر لیں

چشمِ عالم سے تجلی کہیں مجروح نہ ہو
ہم نگاہوں کو حجابِ رخِ جاناں کر لیں

چھیڑ کر آج کوئی قصۂ خوبانِ جہاں
محفلِ شوق میں تابش کو غزلخواں کر لیں

سید ضمیر جعفری

گا رہا ہوں خامشی میں درد کے نغمات میں
بن گیا اک ساحلِ ویراں کی تنہا رات میں

ایک دو سجدے ذرا شہرِ نگاراں کی طرف
اے غمِ ہستی ٹھہر چلتا ہوں تیرے ساتھ میں

زندگی میری تمناؤں، مرے خوابوں کا روپ
پھول میں ہوں، رنگ میں ہوں، ابر میں برسات میں

بارہا اس سادگی پر خود ہنسی آئی مجھے
کر رہا ہوں کس زمانے میں وفا کی بات میں

اک شگفتہ درد، اک شعلوں میں بجھتی چاندنی
اجنبی شہروں سے لایا ہوں یہی سوغات میں

ہر ابھرتی لو سے روشن ہو گیا میرا ضمیر
بک گیا ہر مسکراتی روشنی کے ہاتھ میں

"بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد"

(مشرقی پاکستان —— مانجھیوں کا دیس)

یونس احمر

اندھیرے اجالے، صبح شام، ہر آن، ہر وقت، یہاں تک کہ سوتے جاگتے بھی ایک ہی شغل —— ماہی گیری جیسے یہ لوگ دھرتی نہیں پانی کے باسی ہوں۔ ندیاں نالے دریا جھیلیں تالاب، ان سب کا بہتا، ٹھہرا پانی، ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ آپ کہیں گے ماہی گیری جاگتے میں تو خیر ٹھیک ہے —— مگر سوتے میں؟ بیشک، یہ لوگ رہتے ہیں بھانت بھانت کی کشتیوں، ڈونگوں اور ناؤوں میں ہی۔ ان کے گھر یہی لکڑی کے چلتے پھرتے گھر ہیں۔ وہ سوتے ہیں تو اگلے دن ماہی گیری کے لئے کیل کانٹے سے لیس ہو کر اور نیند میں بھی اس ہی کے خواب دیکھتے ہوئے اس لئے جاگتے کے ساتھ سوتے نہ ہوتو اور کیا ہو؟ ماہی گیری ان لوگوں کی گھٹی میں پڑی ہے اور اس کا کوئی وقت، کوئی موسم نہیں۔

یہ کون نہیں جانتا کہ مشرقی پاکستان جھیل، تال، ندی نالوں اور دریاؤں کی سرزمین ہے اور یہاں کی بود و باش پر سیال چاندی کی رواں دواں چادروں کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ یہی بات ہے جس نے ہمارے مشرقی بازو کے پُرشور ندی نالوں کی تند و تیز موجوں کا منہ پھیر دینے والے جیالے مانجھیوں کو دنیا کے بہترین ملّاح بنا دیا ہے۔ جگہ جگہ ندیاں، قدم قدم پر جھیلیں، گھر گھر تالاب۔ آبِ رواں کے کنارے کنارے بستیاں، بازار، ہاٹ، منڈی بلکہ ایک گھر سے دوسرے گھر تک جانے کے لئے بھی بعض اوقات ڈونگے کشتیاں ہی کام میں لائی جاتی ہیں۔ ہر وقت طوفانوں اور سیلابوں کا سامنا۔ تیز و تند موجوں سے زور آزمائی۔ اس لئے یہاں کے جفاکش اور منچلے لوگوں کو فطرت نے گود میں دریاؤں سے کھیلنے کا ڈھنگ سکھا دیا ہے۔ خبر نہیں کب سے یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا ہے جس طرح پانی کے ساتھ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے، اسی طرح ماہی گیری سے بھی ہے۔ یہ ان کا پیشہ بن چکا ہے۔ اُن کی شکل و شباہت، جسمانی ساخت اس کٹھن زندگی کے سانچے میں پوری طرح ڈھل چکی ہے۔ پُرآشوب دریاؤں کے سینے پر چڑھ کر ان کی تند و

تلاطم خیز موجوں کا مقابلہ کچھ انہی بلاکش مانجھیوں کا کام ہے۔

وقت اور موسم کی طرح ماہی گیری کو سال و سن سے بھی کوئی نسبت نہیں۔ خواہ بادل ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہے ہوں یا کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہو —— مشرقی پاکستان کے دیہات میں سردی اس بلا کی پڑتی ہے کہ اکثر دانت سے دانت بجنے لگتے ہیں، بالکل ایسی سردی جیسے مغربی پاکستان کے میدانی علاقوں میں پڑتی ہے اور پانی جمنے لگتا ہے —— بڑے بڑے دریا اُبل رہے ہوں یا گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہو، گھر سے دور نہریں بہہ رہی ہوں یا پاس ہی چھوٹی سی پُرسکون ندی ہنستے گاتے بہے جا رہی ہو، ماہی گیر اپنے کام میں لگے ہوئے نظر آئیں گے۔ اُدھر صبح کا تارا نمودار ہوا اور اِدھر یہ لوگ کام کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ ہر شخص دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ اپنی دھن میں لگا ہوا نظر آئے گا، خواہ وہ بچہ ہو یا پوپلا بوڑھا، ناتجربہ کار لڑکا ہو یا سرد و گرم چشیدہ مانجھی —— اپنے ساتھیوں سمیت چنگھاڑتے دریاؤں میں جال پھینکنے سے اسے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ اگر وہ اکیلا بھی ہے تو کنارے پر کھڑا ہوا یا بیٹھا ہوا مچھلی کا شکار ضرور کھیل رہا ہوگا۔ اگر موسم خشک ہے تب بھی وہ پورا کا پورا جال ضرور پھینک دے گا یا "بِیل" نالے کے ٹخنوں ٹخنوں پانی میں گھس کر مچھلیاں پکڑے گا۔ کمسن بچوں کی کھیپ کی کھیپ ہاتھوں سے ہی مچھلیاں پکڑتی الگ نظر آئے گی۔ جب ان کی قسمت یاوری کرتی ہے تو مچھلیاں اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے کو دکھاتے اور خوش ہوتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں عوام کے لئے ماہی گیری تفریح بھی ہے اور پیشہ بھی۔ شہری لوگ بھی مچھلی کا شکار کرتے ہیں مگر صرف تفریح کے لئے تاکہ ان کی چھٹیاں یا فالتو وقت ہنسی خوشی گزر جائے۔ یہ لوگ شہر سے باہر نکل جاتے ہیں اور مچھلی کے شکار کا لطف اٹھاتے ہیں۔ لیکن دیہات

کی عام آبادی کی بات اور ہے۔ بلاشبہ دیہات میں رہنے والے یہ سادے عوام ماہی گیری سے سال کے بارہ مہینے خوب خوب لطف اٹھاتے ہیں مگر ساتھ ہی مچھلیاں پکڑ کر اپنی معاشی حالت بھی بہتر بناتے رہتے ہیں۔ ان میں جو ذرا چاق و چوبند، تندرست اور کس بل والے ہیں، وہ اتنی مچھلی ضرور پکڑ لیتے ہیں کہ ان کا کنبہ بھی خوب سیر ہو کر کھائے اور باقی "ماچھ" بیچ کر کچھ پیسے بھی کما لیں۔ یہ ادھر ادھر چل پھر کر اپنی "ماچھ" ضرور کسی کے گھر فروخت کر ڈالتے ہیں۔ خاص کر کھاتے پیتے گھرانوں میں تازہ پکڑی ہوئی مچھلی کی بڑی مانگ ہوتی ہے۔ جب گھر بیٹھے سستے داموں تازہ عمدہ "ماچھ" آجائے تو بازار ہاٹ کون جاتا ہے۔

اگر مچھلی کافی مقدار میں پکڑی گئی تو قریب کے بازاروں میں بھی کثرت سے نظر آتی ہے۔ ویسے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بڑے بوڑھے اور بچے صرف اتنی ہی مچھلی پکڑتے ہیں جتنی انہیں ضرورت ہو۔

گاؤں کے وہ بڑے بوڑھے یا جوان جو صرف ذوق و شوق کی خاطر ضرورت سے زیادہ مچھلی پکڑ لیتے ہیں وہ نہ صرف اپنے علاقوں بلکہ چھوٹے چھوٹے شہروں، حتیٰ کہ دور دست ڈھاکہ تک اپنی مچھلی بکنے کو بھیج دیتے ہیں۔ ادھر بیبیاں بھی خوش ہوتی ہیں کہ چلو گھر بیٹھے اچھی "ماچھ" ہاتھ آ گئی، نوکر تو بازار جا کر بھی خالی ہاتھ لوٹ آئے گا کہ جی آج تو "ماچھ" بہت ہی مہنگی تھی!

مچھلی پکڑنے والے یہ شوقین یا تو بستی ہی کے شوقین اور جیالے ہوتے ہیں یا پھر بچارے کم تنخواہ دار ملازم جو اپنا فرصت کا وقت اس کام میں لگا کر کچھ نہ کچھ کما ہی لیتے ہیں۔ اور اس طرح اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالتے ہیں۔ یہ لوگ اُن نشیبی علاقوں میں مچھلیاں پکڑتے ہیں جہاں سیلاب کے دنوں میں قریب کے دریاؤں، ندیوں نالوں کا پانی چڑھ آیا تھا اور اب اتر گیا ہے۔ یہاں مچھلی عمدہ اور بکثرت ملتی ہے۔ خود ڈھاکہ میں ایسے بے شمار تالاب ہیں جو کسی کی ملکیت نہیں اور لوگ یہاں کثرت سے آتے اور مچھلی پکڑ کر لے جاتے ہیں۔

مگر ایسی کڑی زندگی جس میں کشمکش ہی کشمکش ہو اور انسان دن رات موجوں کے خلاف سینہ سپر اور ان کے ساتھ ہر دم نبرد آزما رہے، کسی دلخوش کن تفریح کے بغیر کیسے بسر ہو سکتی ہے۔ جیسے مغربی پاکستان میں چکی پیسنے والیاں دل بہلانے یا مشقت کا احساس دور کرنے کے لئے گیت بھی گاتی جاتی ہیں یا رہٹ چلانے والے، کھیتی باڑی کرنے والے "ہیر" گانا شروع کر دیتے ہیں یا کوئی سہانا ٹپہ یا ماہیا الاپنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح مشرقی پاکستان کے مانجھی چپو چلاتے، ڈانڈ یا بتوار تھامے اور مچھیرے جال پھینکتے اور مچھلیاں بھرتے، زور زور سے کشتیاں کھینچتے ہیں تو کام کے دوران تھکان دور کرنے کے لئے طرح طرح کے گیت بھی الاپتے رہتے ہیں۔ یہ گیت ان لوگوں کی جان ہیں اور ان سے سارے مشرقی پاکستان کی فضا رس بھری رہتی ہے۔ یہ دھرتی کے سادے مانجھی مچھیرے کٹھن زندگی کے اتار چڑھاؤ، خوشی، غمی، ہمت و جرأت کے یہ میٹھے سریلے گیت گا گا کر کچھ ایسا سماں باندھ دیتے ہیں کہ ساری فضا پر ایک کیف چھایا رہتا ہے۔ یہ گیت ان لوگوں کے دلی احساسات کی ترجمانی کر کے زندگی کو گوارا ہی نہیں خوش گوار بھی بنا دیتے ہیں۔ عام گیتوں کے علاوہ جو لوگ خود ہی گھڑ لیتے ہیں، یا وہ خود بخود ان میں پیدا ہو جاتے ہیں، بعض پڑھے لکھے لوگ بھی ہیں جن کو خدا نے ایسے گیت مرتب کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ کوی جسیم الدین کو کون نہیں جانتا۔ وہ اپنے دیس کے کسانوں، مچھیروں، مانجھیوں کے دل کی دھڑکنیں خوب جانتے ہیں اور بڑی ہی سادگی سے ان کو گیتوں میں سمو دینے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں۔ ان کا ایک گیت ہے "ندیا کے پار"۔ اس کو پڑھ کر وہاں کے لوگ تو درکنار ہم یہاں کے لوگ بھی خود بخود گنگنانے لگتے ہیں اور ایک عجیب حظ محسوس کرتے ہیں گویا یہ ہمارے اپنے ہی گیت ہوں اور ہم مشرقی پاکستان میں نہ ہوتے ہوئے بھی اس سے پورا پورا قرب محسوس کرتے ہیں۔

"ندیا کے پار":

مانجھی رے ـــ
کروں کیسے میں ندیا کو پار!
مجھے لے چلے جو اس پار رے
اسے دوں گی میں پھولوں کا ہار رے
مانجھی رے ـــ
اس پار میں بھیا تک ندی کے
چلی جاؤں گی ساجن کے دوار رے
مجھے لے چل تو ندیا کے پار رے!

یہ ہے ایک بھٹیالی گیت اور اس دوسرے میں بھی ایسا ہی رس گھلا

ہوا ہے :-

رنگ برنگی ناؤ کے مانجھی
آؤ باندھو ناؤ یہاں
چھیڑوں دل کی داستاں
سُن بھٹیالی گیت کو تیرے
نیر بہائے ساگر
اس کی لہر بہائے جائے
میری کمر سے گاگر
لنگر اس نوکا کا مانجھی
مست ہوا سے اڑتا جائے
ساری کا آنچل میرا
رہ رہ کر بل کھائے
مانجھی تیری پیت میں شاید
دل نہ کسی کا ٹوٹا ہوگا
نہ کسی دل نے لہریں گنی ہیں
نہ کوئی گاگر چھوٹا ہوگا

اور حق یہ ہے کہ نہ تو مشرقی پاکستان نہ بنگلا شاعری کا دامن قاضی نذرالاسلام کے رس بھرے گیتوں سے خالی رہ سکتا ہے۔ اس کی ایک مدھر تان کی صدائے بازگشت نظم نہ سہی، نثر ہی میں سہی:

اے گہری ندی کی موجو!
جنم جنم سے تم مجھ کو خس و خاشاک کی مانند
بہاتی رہی ہو!
میں نے اپنے لئے جو گھر تعمیر کیا تھا
اے ندی! اسے بھی تمہاری موجیں بہا لے گئیں!
پھر میں نے جس میں پناہ لینی چاہی مگر وہ
بھی نذرِ آب ہوگیا!
اب میں سب کچھ لٹا کر، سب کچھ کھو کر موجوں کے ساتھ
بہتا جا رہا ہوں!
میں گھر دوبارہ تعمیر کر سکتا ہوں
لیکن دل کا گوہر نایاب گم ہو جانے کے بعد کہاں ملے گا؟
بھاٹا میں ایک بار دل کھو جائے تو وہ بھی
جوار کی طرف نہیں جانا چاہتا!

اے ندی!
تمہاری موجیں ساحل کا ایک ہی حصہ کاٹتی ہیں
لیکن حسن کی ندی کا وہ ایک کنارا بھی نہیں چھوڑتیں!

اور اس ٹیپ کے سُر کے بعد ظاہر ہے اور کونسا سُر کیا ہوگا اور کیا کیف پیدا کر سکے گا۔ بے شک "بھاٹا" میں ایک بار دل کھو جائے تو وہ جوار کی طرف نہیں جانا چاہتا!

"چشم بکشا اندریں دیرِ کہن"

محمد عمر میمن

بعینہٖ حکیم سنائیؒ کے الفاظ: کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ، مگر یہ آج سے کوئی سو برس پہلے تقریظِ آئینِ اکبری مصححہ سر سیدؒ میں خامۂ غالبؔ سے بروئے کار آئے تھے۔ جس میں "نئی روشنی" یعنی مغربی علم و حکمت کی بڑی فراخدلی سے تحسین کی تھی۔ اسی مناسبتِ باہمی کی بنا پر ہم عنوان بالا کے تحت سائنٹفک سوسائٹی آف پاکستان کے چوتھے سالانہ اجلاس کی کارروائی اور اس کا خطبۂ صدارت یہاں پیش کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

"کراچی جیسے شہر میں جو علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز ہے [...]سی سوسائٹی کی طرف سے کانفرنس کا اعلان کوئی ایسی بات نہیں [...]وا کرتی جس پر غیر معمولی حیرت یا مسرت کا اظہار کیا جائے۔" یہ تھے [...]ہ الفاظ جو حسن علی عبدالرحمٰن صاحب نے "سندھ مدرستہ الاسلام" [...] عظیم تاریخی عمارت میں "سائنٹفک سوسائٹی، پاکستان" کی چوتھی سالانہ [...]نفرنس کے موقع پر اپنے خطبہ استقبالیہ میں کہے۔

اس میں شک نہیں کہ کراچی کی پہلودار زندگی میں ہر روز [...]سی نہ کسی ثقافتی یا علمی محفل کا انعقاد کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں۔ [...]بھی سرما کے روپہلے سورج میں، کبھی شام کے ملگجے دھندلکے میں، کبھی [...]ات کو، جب پورا شہر نیون لائٹس کے شش رنگی غبار میں آہستہ آہستہ [...]نگڑائی لے کر یوں بیدار ہوتا ہے جیسے سمندر کے جھاگ اڑاتے پانیوں [...]ے وینس بیدار ہو رہی ہو، یہاں، اس بام سے اس بام تک، چنگ و [...]باب، شعر و سخن، نغمہ و رقص اور علم و ادب کی محفلیں سجتی ہی رہتی ہیں [...]ر مل جل کر اس شہر کی ایک "شخصیت" ترتیب پاتی رہتی ہے، اس کا [...]ردار اسی طرح تراشا گیا ہے۔ اس شہر کی "شخصیت" اور کردار سازی [...] اس عمل میں ان سب عناصر کو یکساں اہمیت حاصل رہی ہے لیکن [...]بھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی محفل بذاتِ خود اس درجہ اہم ہوتی ہے کہ [...]ہ خود آگے بڑھ کر شخصیت سازی کے اس عمل میں سب سے نازک [...]رحلہ کی تعمیر اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے اور یوں شخصیت کے ساتھ خود بھی اہم تر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کی ایک سنجیدہ، وقیع اور علمی مجلس وہ اجتماع تھا جو پچھلے دنوں یہاں منعقد ہوا۔

میں سائنٹفک سوسائٹی (پاکستان) کی اس سہ روزہ کانفرنس کے بارے میں ذکر کر رہا ہوں جس کا ہمارے شہر میں کافی دنوں سے چرچا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ مبیشتر دوسری شہری سرگرمیوں پر اسے فوقیت حاصل ہو گئی تھی تو شاید یہ بات بے محل نہ ہوگی۔ اس لئے کہ مذکورہ جماعت کے پیشِ نظر جو مقصد ہے وہ نہایت اہم ہے اور موجودہ وقت کا تقاضہ بھی۔

آئیے ایک نظر اس مقصد کی طرف بھی ڈالتے چلیں جسے میں نے "نہایت اہم" کہا ہے۔ ان مخصوص نشستوں کو جانے دیجئے جو اردو کے شاعر اور ادیب کبھی کبھار منعقد کر لیتے ہیں بلکہ ذرا ان کانفرنسوں یا بڑے بڑے جلسوں کا تصور کیجئے جو ملک گیر پیمانہ پر منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ کیا ان سب کی کارروائی اردو میں ہوتی ہے؟ اکثر کی نہیں۔ ایسے ماحول میں جہاں معیشت کے ادنیٰ سے شعبوں میں بھی فوقیت کسی غیر ملکی زبان کو دی جائے کسی ملک گیر کانفرنس کی تمام تر کارروائی اگر اردو میں ہو تو کیا یہ چونکنے کی بات نہیں؟ یہ کانفرنس "نہایت اہم" اس لئے تھی کہ اس میں ہر ہر لفظ جو بولا گیا وہ اس زبان میں تھا جسے یہاں کے لوگوں کی ایک کثیر تعداد بولتی اور سمجھتی ہے اور ہماری قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔ کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر کے الفاظ میں یہ "نہایت اہم"

اس لئے بھی تھی کہ "اس کانفرنس کے دوران آپ دیکھیں گے کہ طبیعیات کیمیا، ریاضی، حیاتیات اور دوسرے علوم کے مشکل سے مشکل مضمون کس سادگی اور صفائی کے ساتھ اردو کے سانچے میں ڈھلتے اور سننے والے کے ذہن میں اترتے چلے جاتے ہیں"۔ اس لئے اردو کی گراں مایگی اور اظہار مطالب پر اس کی قدرت کا ایک اور ثبوت میسر آیا۔

یادش بخیر! یہ وہی سوسائٹی ہے جس کی داغ بیل اب سے سو سال پہلے سر سید نے ڈالی تھی اور جس کا دقیع آرگن "تہذیب الاخلاق" کا علمی و ادبی کام ہم سب کے سامنے ہے اور اسی جماعت کے ذریعے سر سید نے پسماندہ مسلمانوں کو یاسیت کے خول سے نکل کر نئی دنیا اور اس کی ترقیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی ترغیب دی تھی، سر سید کے جذبۂ عمل، ان کی بے لوثی اور صداقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ یہ سوسائٹی جدید سائنسی علوم کی تحصیل کا ذوق عوام میں پھیلانے کے سلسلے میں اردو کے وسیلہ سے کام لے رہی ہے اور اسی طرح جو شمع سر سید نے روشن کی تھی اسے روشن رکھنے کی سعی کر رہی ہے۔

دسمبر کی سردی تھی جمعہ کا دن تھا سہ پہر کے وقت یہ کانفرنس منعقد ہوئی، پروگرام کے مطابق اس نیک کام کی ابتدا تلاوت قرآن پاک سے ہوئی۔ جناب ماہر القادری نے تلاوت فرمائی اور اس کے خاتمے پر جناب حسن علی عبدالرحمٰن (صدر مجلس استقبالیہ) نے اپنا خطبہ استقبالیہ پڑھا جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ خطبہ کیا تھا، ایجاز و اختصار سے چند جملوں میں سوسائٹی کے مقاصد پر نظر ڈالی گئی تھی اور ان خدمات کا بھی ذکر تھا جو اس سوسائٹی نے اپنے قیام سے آج تک ملک کی ذہنی نشو و نما اور اردو میں سائنسی علوم کی ترویج کے سلسلے میں کیا ہے۔

ڈائس نہایت سادگی سے سجا ہوا تھا۔ حاضرین محفل کے عین سامنے جو ڈائس کا عقبی حصہ تھا، نہایت جلی حروف میں یہ قرآنی آیت ہمیں دعوت عمل دے رہی تھی۔ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے)۔ اپنے معنی کے اعتبار سے یہ آیت کس قدر برموقع ہے اس کی داد ہر شخص دے رہا تھا۔ اصل میں شمع علم کے نقش کے ساتھ یہ آیت خود اس سوسائٹی کا موٹو اور موٹو گرام بھی ہے اور کس قدر موزوں۔

ہم میں سے اکثر و بیشتر نے حالی کو نہیں دیکھا لیکن حالی کی زندگی اور ان کے جذبوں کے بارے میں سنا یا پڑھا ضرور ہے بلکہ ہمارے بزرگوں سے لے کر اب تک ہم برابر حالی کے خلوص سے فیضان حاصل کر رہے ہیں۔ آج اسی جذبہ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ استقبالیہ خطبہ کے بعد جو خطبہ افتتاحیہ پڑھا گیا اس کا لب و لہجہ بعینہٖ ویسا ہی تھا جیسا حالی کے مضامین ان کے مسدس اور قومی نظموں کی دلسوزی کا ہے۔ مدھم مدھم، دردمند لیکن موثر الفاظ و لہجہ۔ یہ خطبہ جو کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر، جناب اشتیاق حسین قریشی نے پڑھا تھا بلاشبہ دلوں پر گہرا نقش چھوڑنے میں کامیاب ہوا۔ شاید اس کی وجہ پڑھنے والے کا اپنا درد تھا اور اس کے لہجے کی بے لوثی بھی! یوں محسوس ہوتا تھا جو کچھ پڑھا جا رہا ہے وہ پڑھنے والے کے اپنے محسوسات ہیں، تصنع سے عاری! ۔ صرف خلوص اور آئندہ نسلوں کے لئے ایک پیغام عمل۔

انہوں نے اپنے خطبہ کا آغاز اس شکریہ سے کیا جو بقول ان کے اس عزت افزائی پر ان کے ذمہ واجب الادا تھا۔ پورا خطبہ بڑی سلیس، شستہ، سادہ لیکن اثر انگیز اردو میں تھا۔ ان کا مؤرخ ذہن برابر ان اسباب و علل پر مرکوز تھا جو کسی قوم کو، ٹھیک اس وقت جبکہ وہ اپنے عروج کی بلند ترین سنگھاسن پر فروکش ہوتی ہے، دھکیل کر قعر مذلت کی طرف لے جاتے ہیں۔ ان تمام اسباب و علل کو نہایت وضاحت سے کھول کھول کر سامعین کے سامنے پیش کیا محسوس ہوتا تھا حاضرین وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں جو ایک دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے۔

ان کے خطبہ کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اس میں انہوں نے ہمیں اپنی انفرادی ثقافت کی تعمیر پر زور دیا تھا۔ فرمایا "اگر ہمارے دلوں میں اپنی ثقافت کی محبت کا جذبہ نہ ہوتا تو ہم ہندوستان کی تہذیب میں جذب ہونے پر تیار ہو جاتے اور اپنی انفرادیت کو قائم کرنے کے لئے ان سب مصائب کا مقابلہ نہ کرتے جو ہمیں پاکستان کے حصول کی راہ میں پیش آئے۔ ظاہر ہے ہند کیا برا تھا اگر اس کی ثقافت ہمارے لئے قابل قبول تھی لیکن ہمیں اپنی شخصیت الگ بنانی تھی۔ انفرادی شخصیت محض ایک قومی اکائی میں ضم ہو کر اپنے تھوڑے بہت

ممیزات سے دستبردار نہ ہونا تھا۔

"اخلاق کی بلندی، علم و عمل کے میدان میں ترقی یہ تمام باتیں ان کے خیال میں دیگر اقوام کی اندھی پیروی میں اپنی زبان سے دستبردار ہو کر حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ اس طرح ترقی تو کیا اس کی تلچھٹ بھی ہاتھ نہ آسکے گی۔ اگر مادی "خوشحالی" تنگ قمیصوں، چست پتلونوں اور جسم کی ساخت کی نمائش سے ہاتھ آسکتی تو پھر کیا تھا۔ نہ کتب خانے کی ضرورت تھی نہ معمل کی، نہ کسی جامعہ کی نہ کسی دانشکدہ کی۔ پھر تو ایک افسوس تھا جو ہاتھ آجاتا کہ جو کچھ اوروں نے خون پسینہ ایک کر کے حاصل کیا وہ ہمیں درزیوں کی ساحری سے مل جاتا۔"

"جس قوم کو اپنی کوئی چیز اچھی نہ لگے اور دوسروں کی ہر ادا پر فریفتہ ہو وہ کیا زندہ رہ سکتی ہے؟ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک وہ خود آگاہ نہ ہو۔ جب تک اسے خود اپنے ثقافتی ورثے سے وابستگی نہ ہو۔ تاریخ کا کونسا طالب العلم ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ جب تک یورپ میں علوم لاطینی اور یونانی زبانوں کی جکڑ بند میں رہے وہاں کا دورِ تاریکی ختم نہ ہوا۔"

اپنے خطبے کے آخری حصہ میں انہوں نے قوم کے باشعور اور ذہین افراد سے بطور خاص دو باتوں کے لئے درخواست کی: (الف) کہ اگر طبعی علوم کے ماہر اس قوم میں ان علوم کا ذوق صحیح پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان کو اپنی زبان میں منتقل کریں۔ اپنی زبان میں سوچیں، لکھیں سمجھیں اور سمجھائیں تاکہ یہ علوم پھیلیں اور عوام تک رسائی حاصل کر سکیں۔ (ب) کہ اگر قوم کو تباہی سے بچانا مقصود ہے تو اس فاصلہ کو کم سے کم تر کیا جائے جو اس کے اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کے مابین حائل ہے۔ اور یہ فاصلہ نصاب تعلیم اور مدت تعلیم میں کمی سے نہیں بلندیٔ معیار سے کم ہوگا۔

صدارتی خطبہ ڈاکٹر افضال حسین قادری (کراچی یونی ورسٹی) نے پڑھا جس کا عنوان "پاکستان کی حیاتی جغرافیائی ماحولیات" تھا۔ یہ نہایت دقیق سائنسی موضوع پر محیط ہونے کے باوجود بڑا عام فہم تھا اور بڑی رواں اردو میں پڑھا گیا کہ حاضرین کو اس کی مشمولات ذہن نشین کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس امر کی حتی الوسع کوشش کی گئی تھی کہ انگریزی مصطلحات سے گریز کیا جائے اور جہاں ان کا استعمال ناگزیر تھا وہاں ان کے ساتھ ساتھ ان کی ہم معنی اردو مصطلحات سے بھی آگاہ کیا گیا تھا۔ اس بصیرت افروز خطبہ کو سننے کے بعد یہ احساس بالکل بجا تھا کہ ہماری زبان ہرگز کم مایہ نہیں بلکہ اس میں تمام جدید اصطلاحات کو بحسن و خوبی اپنے میں سمو لینے کی مکمل صلاحیت موجود ہے۔ ضرورت صرف اس محنت کی ہے جو اسے رائج کر سکے اور فروغ دینے میں خود اہل علم آگے بڑھیں۔

اس خطبہ کے بعد خورشید حسن صاحب (شریک معتمد) نے ملک کے مختلف گوشوں سے موصول ہونے والے خیر مقدمی پیغام پڑھ کر سنائے۔ گورنر مغربی پاکستان اور وائس چانسلر سندھ یونی ورسٹی کے پیغامات خاصے کی چیز تھے۔ رضی الدین صدیقی صاحب کا پیغام نہایت دلچسپ تھا۔ دراصل یہ ایک "چیلنج" پر مشتمل تھا یعنی کہ بذریعہ اردو جدید سائنسی علوم کا فروغ ان کی ترویج و اشاعت ممکن نہیں! مگر حقیقت یہ ہے کہ اس پیغام کے پیچھے ایک مخلصانہ جذبہ ہی کارفرما تھا ورنہ اگر مقصد مخالفانہ ہوتا تو جناب رضی الدین صاحب اپنی یونی ورسٹی کے مختلف شعبہ جاتی افتتاحیوں میں اس جوش و جذبہ کے ساتھ اردو میں تمام جدید علوم کے تراجم اور فروغ کے لئے انتھک کام نہ کرتے۔

جلسہ کا اگلا پروگرام "روداد سالانہ" تھا۔ اسے شریک معتمد نے پڑھ کر سنایا اور پھر عصرانہ کے بعد ابن سینا پر ایک نہایت پر مغز لیکچر کے ساتھ آج کا پروگرام بطریق احسن ختم ہوا۔ یہ لیکچر جناب سلیم الزماں صدیقی نے دیا تھا اور جلسہ کی صدارت ڈاکٹر نذیر احمد نے کی۔

اگلے روز کوئی ڈھائی بجے، سہ پہر کے وقت مختلف شعبہ جاتی اجلاس منعقد ہوئے مثلاً شعبہ علوم طبعی، علوم حیاتیاتی، علوم ارضیاتی اور شعبۂ تعلیم وغیرہ۔ ان تمام مجالس میں نہایت پر مغز تحقیقی مقالات اردو ہی میں پڑھے گئے جسے صاحب ذوق حضرات نے پسند کیا۔ ان علوم کو اردو میں منتقل کرنے کی مساعی کو سراہا۔

۵ بجے شام بلدیہ کراچی کی جانب سے ایک عصرانہ کا اہتمام بھی ہوا اور پھر ایک عام فہم لیکچر "بازاری غذاؤں میں بیماری کے جراثیم" پڑھا گیا جسے ڈاکٹر احمد علی انور (صدر شعبۂ خوراک و حیاتیات کراچی یونی ورسٹی) نے پڑھا تھا اسے بھی بہت پسند کیا گیا کیونکہ عوام کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔

یہ سہ روزہ کانفرنس کا آخری دن تھا۔ جلسہ ۹ بجے صبح شروع ہوا مختلف شعبوں میں تحقیقی مقالات پڑھے گئے۔ بارہ بجے دن کو

(باقی ۵۹ پر)

"اترائے کیوں نہ خاک..."

رفعت جاوید

وہ چھوٹا سا قلم جو پہلے بھی اپنے جوہر دکھا چکا ہے۔ اب پھر میدان میں آتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ خامۂ غالب کی آتش افشانی — چونکہ یہ شمارہ اسی بزرگ سے منسوب ہے، اس لئے ہر بات میں اس ہی کا حوالہ مناسب ہے — کے برعکس اس کے خامۂ خورد میں اب بھی وہی دم ہے۔ (ادارہ)

اور یہ خاکِ پاکستان کی خاک پاک کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟ جس پر سال کے سال ہمارے فوجی بھائی یوم مسلح افواج کے سلسلے میں پریڈ کرتے ہوئے پاکستانی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں اور اپنے شہری بھائیوں سے گھل مل کر ہنسی خوشی وقت گزارتے ہیں۔ اس دن اپنے قومی جھنڈے کو لہراتے ہوئے دیکھ کر جی کتنا خوش ہوتا ہے اور منہ سے بے اختیار یہ بول نکلتے ہیں۔ جھنڈا اڑتا رہے ہمارا۔ اور اڑتا ہی نہیں بلکہ جھنڈا اونچا رہے ہمارا۔ یقین جانیے جب بھی مجھے پاکستان کا چاند تارے سے آراستہ پرچم لہراتا نظر آتا ہے تو اس کے ساتھ میرا دل بھی آپ ہی آپ اونچا ہی اونچا اڑنے لگتا ہے اور جب کوئی ایسا موقع آتا ہے کہ یہ پرچم لہرایا جائے۔ تو میرا دل پھڑپھڑانے لگتا ہے کہ میں اس کے آن بان سے لہرانے کا منظر دیکھوں۔ اور جہاں اس پیارے پیارے پرچم کے ساتھ ہماری مایۂ ناز فوج — اس کے جیالے جوانوں، اس کے ہر دلعزیز پاسبانوں کی پریڈ اور بینڈ باجے کے ساتھ یا اس کے بغیر کوچ اور اس کے شاہینوں کی پرواز بھی شامل ہو۔ تو پھر کیا کہنے۔ سچ جانیئے اس کے تصور ہی سے دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ اے کاش! ایسے مظاہرے روز روز ہوں — خاکی، سفید، نیلی وردی میرے لئے خوشی کی انتہا ہے۔ اپنے وطن کے ان مایۂ ناز سپاہیوں کو دیکھ کر انسان پھولا نہیں سماتا۔ اور سینہ خود بخود فخر سے تن جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہم چھوٹے چھوٹے پاکستانی ہی تو ہیں جو آگے چل کر اپنے وطن کا مان سپاہی بنیں گے۔

قوم اور ملک کا دست و بازو۔ ان کا سہارا۔ اُن کے محافظ۔ ان کی پشت و پناہ۔ وہ لوگ جو ہمارے بڑے بڑے نازک وقتوں پر کام آئے۔ یہاں تک کہ ہمارا آخری سب سے بڑا انقلاب بھی ان ہی کے دم قدم سے ہوا۔

اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ شکر خورے کو کسی نہ کسی طرح شکر مل ہی جاتی ہے۔ اب یہ سچ مچ کی شکر ہو یا شکر کی بنی ہوئی چیز۔ یعنی مٹھائی جس کے لڑکے بالے دیوانے ہوتے ہیں۔ یا ویسے ہی کوئی میٹھی رسیلی چیز۔ چنانچہ ہمیں بھی جو پرچم کے فرفر لہرانے اور چم چم کرتی فوجوں کے دھوم دھام سے مظاہرے کرنے کے رسیا ہیں۔ اس سال بھی ایک موقع مل ہی گیا کہ ہم اُن کے قریب آئیں۔ اور اپنی آنکھوں سے ان کے کارنامے دیکھیں۔

ہوا یوں کہ ہماری لیڈی پرنسپل نے ہم لوگوں کو یاد فرمایا۔ ان کے ہاتھ میں دو بڑے ہی خوبصورت چھپے ہوئے رسالے سے تھے اور کچھ کاغذات۔ ایک رسالے پر تین بیضوی قسم کے رنگین چکر تھے۔ اور دو تلواروں میں چاند تارا۔ ایسا عمدہ چکنا دبیز کاغذ کہ خود بخود چھونے کو جی چاہا — اس لئے اور بھی کہ اس قسم کا بہترین کاغذ بھی ہمارے وطن عزیز کے دوسرے حصے؛ مشرقی پاکستان میں تیار ہوتا ہے۔ اور اس سے ہمیں باہر سے کتنا ہی روپیہ ہاتھ آتا ہے۔ بعد میں پرنسپل صاحبہ سے معلوم ہوا کہ یہ مسلح افواج کے چوتھے یوم کے لئے جو اگلے دن ۱۳ جنوری کو منایا جائے گا۔ سوونیر چھپا ہے۔ میں نے جوں توں کر کے یہ تحفے

ہتھیار ہی لئے۔ اور ان میں اپنی برّی، بحری اور ہوائی فوجوں کی تصویریں دیکھ دیکھ کر اچھل اچھل پڑا۔ فوج ہو تو ایسی اور اس کا ساز و سامان، اس کے کارنامے۔

خیر، تو پرنسپل صاحبہ نے کہا: "لڑکو! کل خوب چاق و چوبند ہو کر آؤ۔ کل اتوار کو بڑا ہی شاندار میلہ ہوگا۔ فوجیوں کا میلہ جس میں تمہارے فوجی بھائی تمہارے پاس آئیں گے۔ بات چیت کریں گے طرح طرح کے کمالات دکھائیں گے۔ جن کو دیکھ کر تمہاری طبیعت میں ولولہ بھی پیدا ہوگا اور تم بہت خوش بھی ہوگے۔ اور سنو، تمہیں کرایہ دے دے کر نہیں جانا پڑے گا۔ بلکہ فوجی بسیں خود آئیں گی اور تمہیں پولو گراؤنڈ میں یا دوسری جگہوں میں جہاں ایسا ہی فوجی ملن ہوگا تم جہاں جانا چاہو لے جائیں گی اور سنو، میلہ تو ہوگا ہی اور بڑا شاندار لیکن ساتھ ہی اس خوشی اور پیارے فوجی بھائیوں سے ملاپ کے موقع پر مٹھائی بھی تقسیم ہوگی۔"

یہ سن کر تو یار لوگوں کی باچھیں کھل گئیں۔ اور بعض کے دل میں اسی وقت لڈو پھوٹنے لگے۔ اس لئے نہیں کہ مٹھائی ملے گی بلکہ یہ مٹھائی ہمارے فوجی بھائی دیں گے جس کی مٹھاس دوہری ہوگی۔ کیونکہ پیار محبت کی مٹھاس سے زیادہ مٹھاس اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور پھر یہ بھی خوشی کم نہ تھی کہ گھر کے قید خانے سے نجات ہوگی اور ہم تھوڑی دیر کھلی ہوا میں دم لیں گے۔ پڑھائی وڑھائی یا ہوم ٹاسک کا جھنجھٹ بھی نہ ہوگا۔ بعض اس لئے خوشی سے اچھل رہے تھے کہ طرح طرح کے بینڈ باجے سنیں گے، رنگ برنگی فوجیں دیکھیں گے اور خوب موج میلہ ہوگا۔ چھٹی کی تو بات ہی کیا ہے۔ کیونکہ اس دن اتوار پڑتا تھا۔ اور چھٹی ہوتی بھی تو اس کی خوشی کی بات جھوٹی بھلا۔ ہم پاکستان کے نونہال پڑھائی سے کیوں بھاگیں۔ پڑھائی پڑھائی ہے اور کھیل کھیل۔ اور سچ پوچھئے تو کھیل تماشے بھی کھیل کے کھیل اور پڑھائی کی پڑھائی یعنی سکھلائی ہیں۔

تو صاحب وہ دن آیا۔ کتنا سہانا دن! ہم سب لڑکے لڑکیاں ۱۰ بجے تک کیا ۹ بجے ہی دھڑا دھڑ اسکول کے کمپونڈ میں جمع ہو گئے۔ بس آئی۔ ہم سب لپک لپک کر اس پر سوار ہو گئے۔ واللہ کس ٹھاٹھ کی بس تھی کہ گدّوں پر بیٹھتے ہی مزا آ گیا۔ وہ یوں چل رہی تھی جیسے نیچے سڑک ہی نہ ہو۔ اس وقت ہمیں وہ رسالے کام آئے۔ اور ہم ان کے ورق الٹ الٹ کر دیکھنے لگے۔ رو پہلی اوراق پہ سارا پروگرام درج تھا۔ پتے کی بات تو ایک ہی تھی۔ یہ کہ اس یوم کا مقصد ہے یہ بتانا کہ ہماری افواج نے کس طرح اپنے معیار اور مستعدی کو برقرار رکھا ہے۔ اس دن ہر قسم کے لوگ، ہماری طرح چھوٹے بھی اور بڑے بھی، آ کر اپنے فوجی بھائیوں سے مل سکتے ہیں جس سے خود بخود اُن کے متعلق بھرم پیدا ہوتا ہے۔ اور ہم جان جاتے ہیں کہ ہمارا ملک مضبوط اور توانا ہاتھوں میں ہے۔ اور ہمیں اس کے بارے میں ذرا بھی اندیشہ نہیں ہونا چاہئے۔ ان خوبصورت رسالوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ ہمارے بعض فوجی بھائیوں خصوصاً افسروں اور دوسرے کارکنوں نے بڑی بڑی عالمی مشقوں میں خوب کام کیا ہے۔ یوم مسلح افواج سے صرف ہمیں کو ان کا حال معلوم نہیں ہوتا بلکہ باہر کے لوگ بھی ان کا کس بل خوب جان جاتے ہیں۔

میں تو رو پہلی صفحوں پر چھپے ہوئے پروگرام ہی میں کھو گیا۔ واہ واہ! کیا کیا باتیں ہوں گی۔ صدر پاکستان کا حفاظتی دستہ شہسواری گھوڑا کدانے۔ میوزیکل سواری اور ٹنٹ پگنگ کے کیا کیا کمالات دکھائے گا۔ چوگان بازی تو ہم پاکستانیوں کا خاص مردانہ کھیل ہے۔ اس کا شاندار میچ بھی ہوگا۔ دن بھر بینڈ باجے کی سنگت کتنا مزا دیگی۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ ورزش کے مظاہرے، لوک ناچ خاص کر ہمارے پٹھان بھائیوں کا مشہور جیالا خٹک ناچ۔ یہ تو خیر تفریحی باتیں ہوئیں۔ بڑی بات تو خالص فوجی قسم کے مظاہرے ہوں گے۔ یہ کہ حملہ کیسے ہوتا ہے۔ بچاؤ کیسے کیا جاتا ہے۔ دشمن کے ٹھکانوں پر بے پناہ گولہ باری۔ ساتھ ہی توپیں، سگنل کرنے کا سامان۔ فوجی فارموں اور فیکٹریوں کی پیداوار ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بندوقوں سے نشانہ بازی اور بیمار یا زخمی فوجیوں کا علاج معالجہ کیسے ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مزے کی بات یہ کہ لوگوں یعنی ہم جیسے شوقین لڑکوں کو بھی نشانہ بازی کا موقع دیا جائے گا۔

اُدھر پاکستان کے مایہ ناز بحری جہاز بھی ڈاک یارڈ میں کھڑے ہوں گے تاکہ ان کو دیکھنے کے دلدادہ شہری جوق در جوق آئیں۔ اور وہ ساحلی فرودگاہیں جو بحریہ کی مدد اور ضرورتوں کے لئے بنائی گئی ہیں یعنی "کارساز" اور "بہادر" لوگوں کے لئے کھلے ہوں گی کہ وہ آئیں اور ان کو دیکھیں — رات کو ان مقامات گودی اور جہازوں پر ایسا شاندار چراغاں ہوگا کہ وہ جگمگ جگمگ کر اٹھیں گے۔ بحری عملے کے بینڈ باجے پولو گراؤنڈ ہی میں نہیں فریر ہال میں بھی بجتے رہیں گے۔

اور سارا دن خوب رونق رہے گی۔

ایک بات بہت اچھی لگی۔ یہ کہ اس دن ہمارے فوجی بھائی قوم کے لئے "ایٹ ہوم" ہوں گے۔ اور یہ اب کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ کیونکہ ہم لوگ جلد ہی منزلِ مقصود پر جا پہنچے۔ اور اچھل اچھل کر جلدی جلدی بس سے نیچے اتر گئے۔ دیکھا تو دوسرے اسکولوں سے بھی لڑکے لڑکیاں ادھر ادھر آ رہی تھیں اور سب کے سب خوشی سے چہچہا رہے تھے۔ دوسرے لوگوں کے بھی ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے اور سچ مچ اتنی بڑی گراؤنڈ پر بہت بڑا میلہ لگا ہوا تھا۔ ہر طرف رونق ہی رونق اور گہما گہمی۔ بڑ کے کی ایک طرف جو چبوترا بنا ہے، اس پر کراچی کی فرفر چلنے والی ہواہیں ہمارا قومی جھنڈا کس شان سے لہرا رہا تھا۔ اور اس کے سامنے سے پلٹنیں سلامی دیتی ہوئی گزر رہی تھیں ہماری بری افواج کا دم خم دیکھنے کے لائق تھا۔ تربیت یافتہ فوجی کیسی آن بان سے ایک ساتھ قدم اٹھا اٹھا کر چل رہے تھے۔ اور ان کے پوری ہم آہنگی کے ساتھ اٹھتے ہوئے قدموں کی جھلک پاکستان کے ہر شہر لاہور، کوئٹہ، پشاور، ملتان، ڈھاکہ میں ہر کہیں نظر آ رہی تھی جہاں ہماری مسلح افواج کا دن اس ہی وقت بالکل اسی اہتمام سے منایا جا رہا تھا۔ ہمارے یہ کڑیل جوان کیا تھے صحت، قوت، بہادری، تربیت اور نظم و ضبط کی چلتی پھرتی تصویریں۔ ان کو دیکھ کر ہمارے چھوٹے چھوٹے سینے بھی خود بخود تن گئے۔ جیسے وہ نہیں، ہم مارچ کر رہے ہوں۔ اور اس میں تعجب بھی کیا ہے۔ آخر ہم جیسے قوم کے نونہال ہی تو اچھی تعلیم، اچھی تربیت پا کر فوج میں شامل ہوں گے۔ کوئی فوجی جوان بنیں گے، کوئی بحریہ کے سپوت اور کوئی شاہین۔ میرے خدا ٹینکوں کی وہ شاندار قطار اور بڑی بڑی توپیں جن کی سلامی کی پہلی پہلی گھن گرج اب بھی کانوں میں گونج رہی تھی۔ بیگ پائپوں کی سریلی مست کن آواز اور ڈھول کی ولولہ انگیز ضرب۔ آگے آگے رنگ برنگی وردی پہنے روپہلی عصا ہلاتا اور کبھی کبھی ہوا میں اچھالتا قوی ہیکل جوان، کتنا مزا آتا تھا اس کو دیکھ کر —— وہ سرتاپا سفید براق بحریہ قطار اندر قطار، وہی طمطراق وہی آن بان۔ اور شاہین۔ زمین پر یوں چلتے ہوئے جیسے وہ اونچی فضاؤں میں شاہانہ پرواز کر رہے ہوں۔ دیکھنے میں فوج کے بازو تین مگر درحقیقت مکمل طور پر ایک۔ وہ اور ان کا ساز و سامان سبھی ملک کی زیادہ سے زیادہ طاقت اور حفاظت کے ضامن ہیں۔ جبھی تو آڑے وقت میں بھی یہ قوم کے کام آ سکے۔ اور ملک کے اندر ہی کیا باہر بھی انہوں نے پاکستان کی ایسی دھاک قائم کی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ کون نہیں جانتا کہ مغربی ایریان اور کانگو میں ہماری فوج کے چھیلے جوانوں نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ہمارے سپاہی اور ملاح اقوام متحدہ کے زیر سرکردگی اُن دونوں ملکوں میں گئے۔ لطف یہ کہ انڈونیشیا اور ہالینڈ دونوں حریفوں نے بڑی خوشی سے ان کا اپنے یہاں آ کر خدمات انجام دینا قبول کیا۔ ہمارے فوجی بھائیوں نے دونوں جگہ بڑی ہی تن دہی، مستعدی اور خلوص سے کام کیا۔ اور اپنے حسن سلوک اور حسن عمل سے کانگو اور مغربی ایریان دونوں کے باشندوں کو اپنا دوست اور گرویدہ بنا لیا۔ یہ دیکھ کر تو اقوام متحدہ نے طے کر لیا کہ آئندہ جب بھی امن کی خاطر فوجی امداد کی ضرورت پیش آئے گی، تو پاکستان کا نام سرِفہرست ہوگا۔

اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ وہ علاقہ جو آج پاکستان کہلاتا ہے، صدیوں سے ایسے لوگوں کا گہوارہ رہا ہے۔ جو سپاہی بننے پر ناز کرتے ہیں۔ شجاعت اور سپہگری ان کی روایات ہی میں نہیں ان کے خون میں داخل ہے۔ ان کے نزدیک فوجی ہونا سب سے زیادہ فخر کی بات ہے۔ بچہ بچہ وقت آنے پر سپاہی بننے کا اہل ہے۔ ذرا سی تربیت دی اور وہ سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ جبھی تو ہمارے فوجی ہمارا مان ہیں۔ اور دنیا بھر میں بہترین مانے جاتے ہیں۔ آج ہماری فوج مشرق میں سب سے زیادہ چاق چوبند فوج ہے جو ہر مہم میں پوری اتر سکتی ہے۔ کئی رجمنٹیں تو ایسی ہیں جن کا سکہ دو دو سو سال سے قائم ہے۔ اور انہوں نے دونوں عالمی جنگوں میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہماری فوج میں اچھے اچھے نامور کھلاڑی بھی پیدا کئے ہیں۔ مثلاً میجر حمیدی اور میجر عاطف جو ہاکی کے مشہور کھلاڑی ہیں۔

خوب یاد آیا۔ یہ ہماری فضائیہ ہی کا ایک نوجوان تھا جس نے بلا کی مستعدی سے ایک در آنے والے لڑاکا جہاز کو پائلٹ سمیت مار گرایا تھا جو ہمارے فوجی ٹھکانوں کے فوٹو لینے آیا تھا۔

ہماری پیدل فوج کو بجا طور پر میدان جنگ کی ملکہ کہا جاتا ہے۔ پنجاب رجمنٹ، بلوچ رجمنٹ اور فرنٹیئر فورس رجمنٹ سب کی سب اپنی بہادری اور جواں مردی کے لئے شہرۂ آفاق ہیں۔ فوجی جانفروں

اور علاء کے لئے اسٹاف کالج کوئٹہ دنیا کے اہم ترین کالجوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس سوونیر میں دنیا کا نقشہ کیسا عمدہ بنایا گیا ہے۔ اور اس میں مشرقی و مغربی پاکستان اور اہم فوجی مقامات کس خوش اسلوبی سے دکھائے گئے ہیں۔ گھر آکر میں بھی برش اور کلر بکس لے کر بیٹھ گیا کہ ایسا ہی خوب بڑا نقشہ بناؤں اور اس کو دیوار پر لٹکا دوں۔ ہاں، اور وہ جو فوجی جوانوں کو رسیاں پکڑ پکڑ کر اوپر چڑھتے دکھایا گیا ہے، اسی طرح رسیوں کو پکڑ کر میں بھی اوپر چڑھنے کی مشق کرتا رہا۔

جہاز سازی کی گودی ہمارا ایک اور بڑا کارنامہ ہے۔ اس کی واقعی بڑی ضرورت تھی۔ اب ہمارا بحریہ، خدا کے فضل سے ہر طرح اتنی ترقی کر چکا ہے کہ یہ دونوں بازوؤں کی پوری پوری حفاظت کر سکے۔ اس میں سکھلائی، ساز و سامان اور درستی و مرمت سب کا پورا پورا اہتمام ہے۔ ساحل ساحل بحری فرودگاہیں بھی ہیں۔ بہادر، ہمالیہ، دلاور۔ اس طرح ۵۱ ایک سال میں بحریہ کچھ کی کچھ ہو گئی ہے۔ جہاز خریدے گئے، تربیتی ادارے قائم ہوئے، مرمت و درستی کا انتظام ہوا۔ اور دوسرے ملکوں کے ساتھ مل کر کتنی ہی مشقیں بھی ہوئی ہیں۔ پی۔ این۔ ایس "بہادر" "کارساز" "ہمالیہ" لڑکوں کے تین بڑے ادارے ہیں۔ طوفانوں اور سیلابوں کی روک تھام، ان کے سلسلے میں مدد، سمندر کی تہہ کی پیمائش اور جائزہ۔ اور ساحلی پیمائش کے سلسلے میں بڑا کام ہوا ہے۔ مشرقی پاکستان میں چالنا کی نئی بندرگاہ اس ہی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ چاٹگام میں جو سمندری اکیڈمی قائم ہوئی ہے، وہ اچھے اچھے افسر اور جہاز راں پیدا کرے گی۔

زمین، پانی اپنی جگہ ہیں، ہوا اپنی جگہ۔ اور اس کی بات ہی کیا ہے۔ آگے سے آگے بڑھتے جانے کے لئے فضا ہی کام آتی ہے اور ہم ایسا کر بھی رہے ہیں۔ تربیتی ادارے قائم ہوئے۔ نئی وضع کے جہاز ٹائیگر ماتھ، ہارورڈ وغیرہ خریدے گئے۔ اور اب تو جٹ طیاروں کا دور ہے۔ سب سے بڑی بات رائل پاکستان ایئر فورس کب کا صرف پاکستان ایئر فورس بن چکا ہے۔ اور یوں کتنے ہی خواب ہیں جو پورے ہو چکے ہیں۔ ہمارے شاہین اور شاہباز برابر عالمی مشقوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ اور ملک میں جو ٹڈی دل آتے رہتے ہیں، ان کو ملیامیٹ کرنے میں فضائی بیڑے نے بڑا کام کیا ہے۔ سیلاب زدگان کی امداد کے سلسلے میں جو کام کیا گیا ہے، اس کو کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

یہ سب کچھ میں نے اور میرے ساتھ ہزارہا پاکستانیوں، چھوٹوں اور بڑوں، نے پڑھا ہی نہیں، اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور گو سارا دن ادھر اُدھر چلتے پھرتے ——— کبھی سرکاری فوجی بسوں اور کبھی ٹینکروں میں ——— گزرا جس سے تکان تو ضرور ہوئی لیکن جو تفریح ہوئی اس سے ایسا لگا جیسے ہم اسی طرح بشاش بشاش گھر واپس آرہے ہیں۔ جیسے صبح روانہ ہوئے تھے۔

بہت اچھا ہے کہ یہ دن ہر سال اسی طرح منایا جائے۔ یہاں تک کہ ہم نئی پود کے لوگ بڑے ہو کر خود کیڈٹ بنیں اور اپنے بعد کی نسل کو پاکستانی فوج کا ایسا ہی شاندار منظر دکھا سکیں ؂

"چشم بکشا اندریں دیر کہن" : ——— بقیہ صفحہ ۵۵

اجلاس ختم ہوا۔

سہ پہر ۳ سے ۵ بجے تک ایک مذاکرہ بعنوان "ملک کی معاشی ترقی کے لئے وسائل کا استعمال" منعقد ہوا جس کا افتتاح جناب غلام فاروق صاحب سابق گورنر مشرقی پاکستان نے کیا اور صدارت جناب رضی الدین صدیقی نے فرمائی۔ اس میں ملک کے مشہور دانشوروں نے شرکت کی اور اسے ان اجتماعات کا اگر گل سرسبد کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

شام ۵ بجے سندھ مدرسہ بورڈ کی جانب سے (جس نے اس سال کانفرنس کے انعقاد کے سلسلہ میں مہمان نوازی کے فرائض قبول کئے) ایک عصرانہ کا اہتمام بھی ہوا اور اس طرح یہ سہ روزہ کانفرنس بڑی کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ ملک کے ممتاز سائنسداں اور دانشور ملک کی ضرورتوں کو محسوس کر رہے ہیں اور جلد یا بدیر انہیں یہ احساس ہو گیا ہے کہ اپنی زبان ہی اپنی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے اور ملک میں سائنس و ٹکنالوجی کے فروغ میں ہماری زبان بڑا اہم کردار ادا کر سکتی ہے اور اسی تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے خلائی و فضائی دور میں ہم دوسروں کے ساتھ اگر ہمقدم رہنا چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو ان علوم کی تحصیل کی طرف متوجہ کرنا پڑے گا اور جیسا کہ خود صدر پاکستان بار بار ہمارے نوجوانوں کو تلقین کر رہے ہیں ملک کو سائنس کے فیضان سے بہرہ ور ہونا چاہیے مگر ساتھ ہی اپنی روحانی و ثقافتی اقدار کے سرچشموں سے بھی ہمیں دور نہیں جانا چاہیے کیونکہ علم اور عمل کی راہیں ہمیں اپنی منزل کی طرف تب ہی لے جا سکتی ہیں جب ہم اپنے ماضی کے درخشاں پہلوؤں سے بھی آگاہ ہوں اور نئے تقاضوں کو بھی اپنی زندگی کا آدرش بنائیں ؂

آزاد بنامِ غالب : ــــ بقیہ صفحہ ۱۱

خیال یا علمی مطالب یا دنیا کے معاملات خاص میں
مراسلے لکھے، تو اس انداز میں ممکن نہیں" (ص ۶۳۹)

اس پر مزید حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ اردوئے معلیٰ کی زبان صرف بات چیت اور خط و کتابت (اور وہ بھی غیر سنجیدہ موضوع ہی) تک کار آمد ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس زبان میں کسی اہم موضوع، تاریخ یا اخلاق یا کسی خاص علم کا بیان کرنا چاہے، تو یہ زبان اس طرح کے مفہوم کے ادا کرنے میں قاصر رہے گی۔

۸۔ پھر اسی پر بس نہیں کرتے۔ عام خیال ہے اور یہ ہے بھی درست کہ اردوئے معلیٰ کے خطوں کی زبان، ان کا فکاہی انداز اور بے ساختہ پن ایسا ہے کہ انسان اگر انہیں پڑھنا شروع کرے، تو بے تکان پڑھتا ہی چلا جائے اور اس کی سیری نہ ہو۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:-

"پورا لطف ان تحریروں کا اس شخص کو آتا ہے کہ جو خود ان کے حال سے اور مکتوب الیہوں کی چال ڈھال سے اور طرفین کے ذاتی معاملات سے بخوبی واقف ہو۔ غیر آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس لئے اگر ناواقف اور بے خبر لوگوں کو اس میں مزہ نہ آئے، تو کچھ تعجب نہیں۔" (ایضاً)

۹۔ اس کتاب میں قلم، التماس کو مؤنث، پنشن، بیلہ، نارک کو مذکر فرمایا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: میرا اردو بہ نسبت اوروں کے فصیح ہوگا۔" (ایضاً)

یوں معلوم ہوتا ہے کہ قلم، غالب کے زمانے تک مونث بھی لکھا جاتا تھا۔ ظفر کا شعر ہے:-

عجب احوال ہے میرا کہ جب خط اس کو لکھتا ہوں
تو دل کچھ اور کہتا ہے، قلم کچھ اور کہتی ہے

بلکہ اگر خود مولانا آزاد کا اعتبار کیا جائے تو یہ شعر ظفر کا نہیں بلکہ ان کے اپنے استاد ذوق کا ہے کیونکہ یہ ظفر کے دیوان سوم میں ہے۔ (ص ۱۵۴)

'التماس' دلی میں مذکر ــ اور لکھنؤ میں مؤنث ہے۔

انگریزی لفظوں کی تذکیر و تانیث کا اس زمانے تک تعین ہی کہاں ہوا تھا کہ اس پر اعتراض ہو، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابھی تک اس بارے میں کوئی ایک قاعدہ متعین نہیں ہوا۔ ایک ہی لفظ کوئی مذکر لکھتا ہے، کوئی مؤنث۔

یہ ہے مولانا آزاد مرحوم کی فرد جرم غالب کے خلاف۔ اس سے آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ:-

(۱) غالب دراصل اردو کے نہیں فارسی کے شاعر تھے۔
(۲) ان کی تعلیم و تربیت ناقص رہ جانے سے وہ اس میں بھی صحیح اور خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے،
(۳) اردو میں ان کا اکثر کلام ناقابلِ فہم یا دوسرے لفظوں میں بے معنی ہے،
(۴) اردو میں وہ غلط محاورہ اور روزمرہ لکھتے ہیں،
(۵) وہ اردو نثر میں فارسی ترکیبوں اور محاوروں کا ترجمہ لکھتے ہیں جو اردو کے اہلِ زبان کے روزمرہ کے خلاف ہوتا ہے،
(۶) ان کی اردو سوائے غیر سنجیدہ تحریر کے اور کسی مصرف کی نہیں اور
(۷) ان کے اردو خطوط عام قاری کے لئے بے مزہ ہیں؛

*

غالب بنود شیوۂ من قافیہ بندی
ظلمے ست کہ بر کلک و ورق می کنم امشب

•

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نقد و نظر:-

"راہِ سخن وا کرے کوئی"

عبداللہ خاور

کچھ عرصہ گزرا ہم نے نقد و نظر کے لئے یہ تازہ عنوان طے کیا تھا لیکن فردا لیس فردا ملتوی ہوتے ہوتے نوبت اس شمارہ تک پہنچی جو غالب سے منسوب ہے اور اس طرح حق بکار آخر حقدار تک پہنچ ہی گیا، مگر خود راہِ سخن وا کرنے کی بجائے ہم یہ مہم ایسے مردِ کارواں کے سپرد کر رہے ہیں جو شاعر اور مبصر دونوں کے لئے "دلِ گداختہ" رکھتا ہے" کا وہم از رازو ہم از سازِ آگہست"۔ اور یہ راز و ساز ظاہر ہے غالب کا فارسی کلام اور اس کے نکات و معانی ہی ہیں۔ ر۔ خ نہ سہی ع۔ خ یعنی عبداللہ خاور ہی سہی! ---- (ادارہ)

غالب نے کہا اور بہت زور شور سے کہا کہ برصغیر میں فارسی سخن آرائی کا سلسلہ "ز عرفی و طالب بہ غالب رسید۔" اور یہ کہ از بازپسین نکتہ گزاران پیشم یہاں تک کہ اردو کو "بے رنگِ من است" قرار دے کر "فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ" کا آوازہ بلند کیا۔ لیکن "منکرانِ شعرِ من" نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گو بعض فارسی دوستوں نے بادۂ فارسی سے سرمستِ سخن ہونے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی جو میخانے، بقول شاعر "در بنِ ہر لفظ" چیدہ ہیں وہ بڑی حد تک ناشنیدہ، نادیدہ اور ناچشیدہ ہی رہے۔

ہمارے یہاں فنکار تخلیق کرتا ہے اور نقاد فیصلے صادر کرتے ہیں۔ غالب نے کہا "فارسی بیں . . ." نقاد نے کہا یہ تو ذوق سے کہا ہے، ہم سے نہیں۔ اور ہم سے بھی کہا ہے تو اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ غالب کا اردو کلام ان کی بقائے دوام کا ضامن ہے جس کی عظمت کا خود انہیں اندازہ نہ تھا۔ چنانچہ غالب کی زندگی، تحقیقاتِ غالب اور ان کی اردو شاعری کے علاوہ ان کے خطوط ــــ غرض سب ہی کچھ زیرِ بحث آئے۔ نہ آئی تو ان کی فارسی شاعری۔

سرسید نے تذکرہ اہلِ دہلی میں سب سے پہلے غالب کا ذکر فارسی شعرا کے زمرہ میں کیا۔ حالی نے یادگارِ غالب میں ان کے فارسی کلام کے تجزیہ اور افہام و تفہیم کی طرف توجہ کی۔ پھر ایک جگ بیت گیا اور شیخ محمد اکرام غالب کے فارسی کلام کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے تفصیلی بحث کے ساتھ کلام کا انتخاب بھی کیا۔ چند اور اہلِ ذوق، مثلاً نیاز فتحپوری، عرشی، غلام رسول مہر، مالک رام اور ڈاکٹر یوسف حسین وغیرہم نے اپنی تحریروں میں غالب کی فارسی شاعری کا ذکر کیا مگر اس پر زیادہ گہری نظر نہیں ڈالی۔ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے بھی اس کو بہ اندازِ محرمانہ دیکھا۔ بہر حال اس کا اعتراف تقریباً سب ہی کو ہے کہ غالب کا فارسی کلام اساتذۂ ایران کے کلام سے کسی طرح کم رتبہ نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے "نقش ہائے رنگ رنگ" کسی نے نہ دیکھے اور ان پر تاریکی کے دبیز پردے ہی پڑے رہے۔ ڈاکٹر عارف شاہ گیلانی نے، خونِ گرمم کو یکن دار در رگِ تیغال ما، کے مصداق ادھر توجہ دی اور اپنا تحقیقی کارنامہ "غالب، اس کی زندگی اور فارسی شاعری" (بزبان انگریزی) پیش کیا۔ جس میں شاعر کی زندگی اور اس کے فن کے کئی گوشے اجاگر کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب میں غالب کے متعلق پورا سرمایہ پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور اردو فارسی نظم و نثر کی تمام اصنافِ سخن پر تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ مآخذ کا وسیع و عریض میدان بجائے خود ناقد کی ہمتِ عالی کا آئینہ دار ہے۔

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے میں غالب کے حالات ہیں اور دوسرے میں ان کی شاعری اور فن پر گفتگو ہے۔ آخری حصہ کی ترتیب میں مصنف نے فارسی شاعری کی اصناف پر بھی گہری نظر ڈالی ہے تاکہ فارسی شاعر کی حیثیت سے غالب کے صحیح مقام کا تعین کیا جا سکے۔

تمہید میں سب سے پہلے عصرِ غالب کا سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی جائزہ اس طرح لیا گیا ہے کہ پورے دور کی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے اور غالب کی شخصیت اور شاعری دونوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ دور انقلابوں اور آشوبوں کا دور تھا جس میں غالب کو اپنی پوری زندگی گزارنی پڑی۔ پہلے حصہ میں غالب کی تاریخ ولادت، ان کی تعلیم و تربیت، خاندانی حالات، اساتذہ کا ذکر، دہلی منتقل ہونے کی تاریخ، دہلی میں قیام، کردار، قید و بند، حلیہ، مذہبی عقائد، علالت اور وفات تک کوئی ایسا اہم پہلو نہیں جس پر مصنف نے تحقیقی نظر ڈال کر کوئی فیصلہ نہ دیا ہو۔ ان معاملات میں جو دلائل اور شواہد پیش کئے گئے ہیں ان میں غالب کے متعلق بعض نئی معلومات اور تحقیقات بھی سامنے آئی ہیں اور غالب دوستوں کے سامنے نئی راہیں کشادہ ہوتی نظر آتی ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں غالب کی فارسی شاعری کا بڑی تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں غالب کی فارسی استعداد، ان پر اساتذۂ ایران کے اثر، نظیری اور بیدل کے تتبع، اور پھر صنف وار غالب کی شاعری کا ایک بسیط جائزہ ملتا ہے۔ غرض کوئی بات ایسی نہیں چھوڑی گئی جو فارسی شاعر کی حیثیت سے غالب کا صحیح مقام متعین کرنے میں ہماری رہنمائی نہ کرے۔

مصنف خود فارسی کا شاعر ہے اور فارسی زبان و ادب پر عبور رکھتا ہے اس کا اندازِ فکر سائنسی ہے جس کا ثبوت کلامِ غالب کی تنقید و تبصرہ میں جا بجا ملتا ہے۔ ہر صنف میں غالب کے فن اور اندازِ کلام کی خصوصیات، اساتذہ سے موازنہ اور ان کی تاریخی اہمیت واضح کرتے ہوئے غالب کا مقام متعین کرنے کی جس طرح کوشش کی گئی ہے وہ نقد کے اعتبار سے بھی اہم ہے اور حقائق کی تفصیل و تجزیہ کے اعتبار سے بھی۔ خصوصاً قصائدِ غالب کا جامع تجزیہ اپنی جگہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ غالب کا کلام بہ اعتبارِ زبان و معنی ایک باریک بیں شاعر کا کلام ہے اور اسے پرکھنے کے لئے پہلے اس کی وسیع کائنات پر حاوی ہونے کی ضرورت ہے۔ مصنف نے تقریباً بیس برس اس پر صرف کئے ہیں۔ اس لئے غالب کے فارسی کلام میں اسے جو نکتے نظر آئے وہاں تک شاید بعض معروف مبصرینِ غالب کی نگاہیں بھی کم پہنچی ہونگی۔ غالب کے نظریۂ شعر و فن کا خود غالب ہی کے اشعار اور تحریروں سے جس طرح استنباط کیا گیا ہے وہ بھی مصنف کی نکتہ رسی و دقتِ نظر کی ایک روشن مثال ہے۔

غالب میں ابہام کی دریافت تو کوئی نئی بات نہیں البتہ اس کے متعلق مصنف کا یہ جواز ضرور قابلِ غور ہے کہ فکرِ غالب میں ہمیشہ گہرائی اور ندرت کا جوہر ملتا ہے اور ان کے کلام تک پہنچنے کے لئے قاری کو اپنے اندر فکر و خیال کی وسعت بھی پیدا کرنی پڑتی ہے اور زحمت بھی۔ غالب خود باریک بیں ہیں اور اپنے قاری سے بھی باریک بینی کی توقع رکھتے ہیں۔ مصنف نے یہ کہنے کی خاطر ہی نہیں کہا ہے بلکہ اپنی اس تصنیف میں غالب کے ساتھ اپنی باریک بینی کا ثبوت دیا ہے۔

غالب کے مقام کا تعین کرنے میں جس دقتِ نظر سے کام لیا گیا اس کا اندازہ ان عنوانات سے بھی لگایا جا سکتا ہے: (۱) کیا غالب تقلیدی شاعر تھا؟ (۲) فارسی شاعری میں غالب کا مرتبہ۔ (۳) ہماری شاعری میں غالب کا مقام۔ (۴) معاصر شعراء میں غالب کا درجہ (۵) غالب کا اندازہ اپنے بارے میں۔ (۶) معاصرین کی رائے۔ (۷) پیغام۔ ان توضیحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ اس سے زیادہ شرح و بسط کیساتھ اب تک پیش نہیں کیا گیا تھا۔

یوں تصنیف کے بعض مباحث سے جزوی اختلاف ہو سکتا ہے اور ان امکانات کے پیشِ نظر ہی مصنف نے لکھا ہے:
"میں تکمیل کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اگر تکمیل کے حصول میں صاحبِ نظر حضرات تعمیری مشورے دیں تو ذاتی طور پر ممنون ہونگا"۔
کوہ کنی کا سلسلہ یہیں نہیں ختم ہو جاتا بلکہ ایک اور جوئے شیر بھی نکالی گئی ہے یعنی غالب کا تمام فارسی کلام پیشِ نظر رکھ کر کتاب کے آخر میں ایک ہزار اشعار کا برجستہ انتخاب بھی دیا گیا ہے جس نے تصنیف زیرِ نظر کو ہر اعتبار سے مکمل اور قابلِ قدر بنا دیا ہے۔

★

"رنجِ گراں نشیں"

آج ہمیں رنجِ گراں نشیں کی شکایت کئے بغیر چارہ نہیں۔ جس سے ہمارے قلب و جگر فگار اور آنکھوں سے جوئے خوں رواں ہے۔ بیدادِ اجل نے ہمیں پھر ناگہاں ایک ایسے ستارۂ روشن سے محروم کر دیا ہے جو ہمارے افقِ ملت کے لئے وجہ فروغ تھا اور مشرقی پاکستان ہو یا مغربی، اس کے ماتم میں سیہ پوش ہے۔ ہمارے وزیر خارجہ جناب محمد علی — جو پہلے بحیثیت سفیرِ پاکستان اور پھر وزیر اعظم کی حیثیت سے ملت کے اُفق پر بڑی آب و تاب سے فروزاں ہوئے تھے اور اب پھر جب دورِ انقلاب کے بعد نئے آئین نے جمہوریت کی شعاعوں سے معمور، روشن تر فضا پیدا کر دی تھی وہ اور بھی آب و تاب سے ایک نیا حیات افروز کردار ادا کرنے کے لئے منظرِ عام پر آئے تھے۔ اور انہوں نے اپنے نئے عہدے کی مختصر مدت — خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود! — میں اس کا نمایاں ثبوت بھی دیا تھا۔ اس لئے تمام افرادِ ملت کی نگاہیں اُن پر مرکوز تھیں اور اُن کی ذاتِ گرامی سے اُن کی بہترین امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن افسوس! وہ جانکاہ مرض جس کا شکوہ انسان کو ازل ہی سے رہا ہے، اس نے بہت ہی بے وقت ہمیں اس ستارۂ روشن کی تابانیوں سے محروم کر دیا۔ عین اس وقت جب وہ ہمارے ملی اور بین الاقوامی لائحۂ عمل میں ایک نئی جوت جگا رہا تھا، اس کی شعاعوں میں ایک نئی تابانی پیدا ہو رہی تھی اور اہلِ ملک کو اس کی بصیرت افروز رہنمائی کی اشد ضرورت تھی۔ اس ستارے کا روپوش ہو جانا جو ہماری ملت کے مقدر کی تشکیل کا ضامن تھا، یقیناً ایک عظیم سانحۂ ملی اور ناقابلِ تلافی نقصان ہے، جس پر قوم کا ہر فرد اشکِ خوں بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دعا ہے کہ خداوند کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پاکستان کی جس ترقی و خوشحالی کا خواب وہ عمر بھر دیکھتے رہے اور جس کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر آخری دم تک کوشاں رہے، وہ حقیقی معنوں میں روشناسِ تعبیر ہو۔ پاکستان کی اس مایۂ ناز ہستی کے پسماندگاں اور سوگوارانِ ملت کو اگر کوئی بات وجہ تسلی ہو سکتی ہے تو یہ کہ:

مرنے والے کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

"ماہ نو"

اشاعت خاص

مارچ ۱۹۶۳ء

سابقہ روایات کے مطابق اس سال بھی "ماہ نو" یوم پاکستان کی تقریب پر اپنا خاص نمبر شائع کر رہا ہے جس کی ترتیب کا کام شروع ہو چکا ہے۔

برّصغیر کے ممتاز اہلِ قلم اس میں حصّہ لے رہے ہیں

★

چار صفحے کی آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی رنگین و دیدہ زیب تصاویر

۱۲ صفحے کی سادہ تصاویر

ـــ فن ـــ تاریخ ـــ معاشرہ ـــ ثقافت ـــ ادب

ـــ علاقائی شہ پارے ـــ کہانیاں

ـــ نامور شعرا کا تازہ کلام

سرورق : نفیس نقاشی کا نادر نمونہ

ضخامت : دگنی

★

فی کاپی ایک روپیہ ۲۵ پیسہ

سالانہ خریداروں کو یہ اشاعتِ خاص

اور اکتوبر میں شائع ہونے والی ایک اور

خاص اشاعت سالانہ چندہ ہی میں

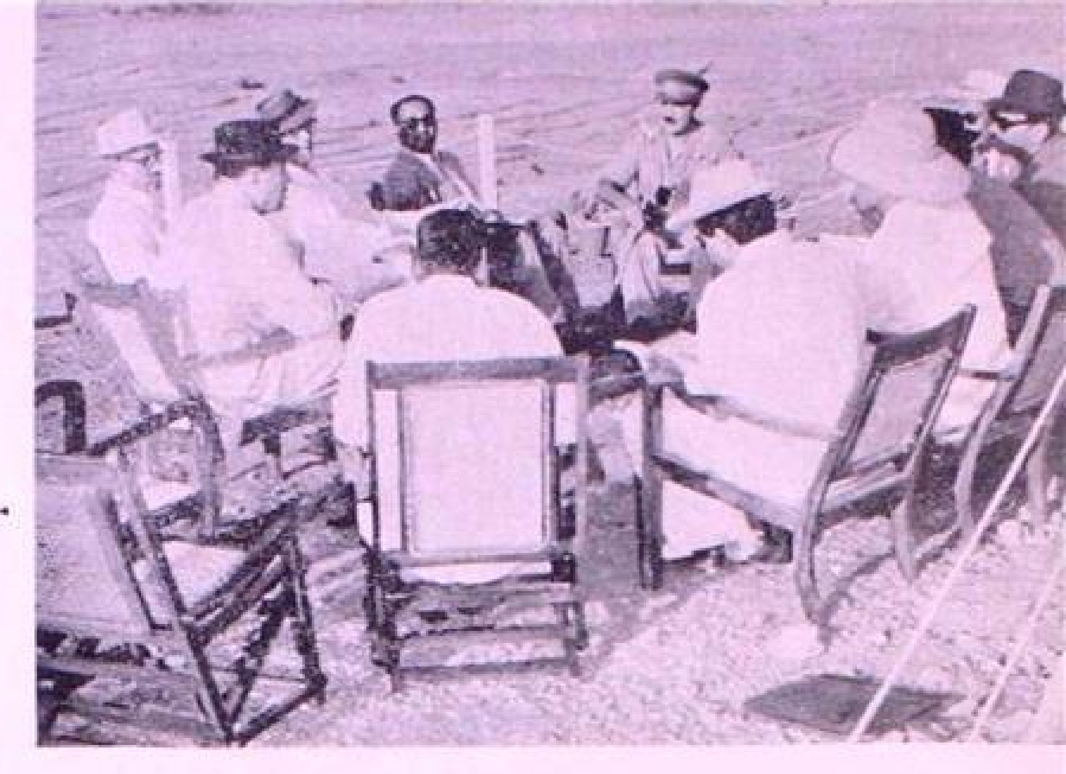
پیش کی جاتی ہے۔

مشتہرین اور ایجنٹ حضرات فی الفور توجہ فرمائیں

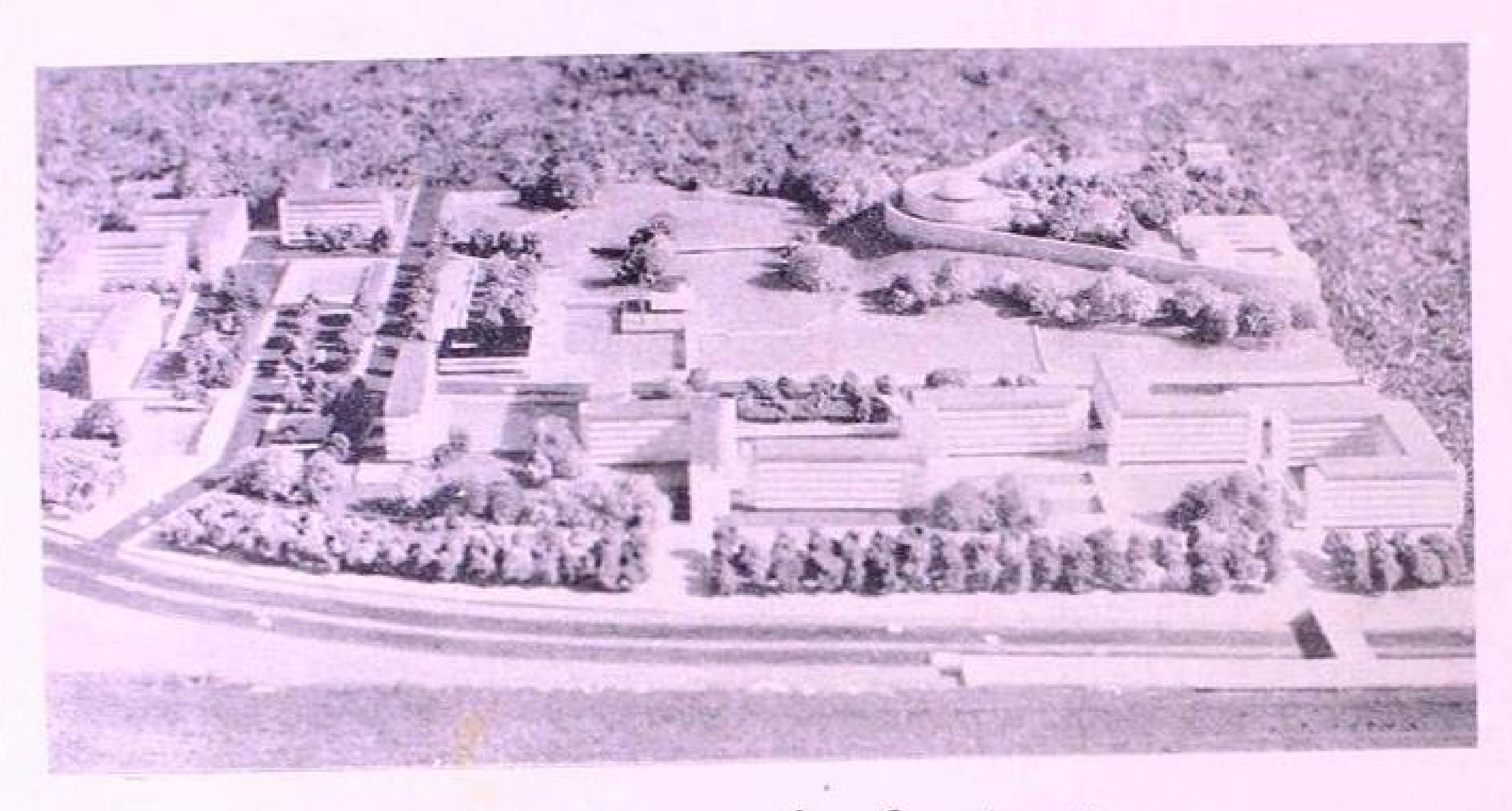
ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ ـ کراچی

"جہاں جہاں گل نظارہ"

اسلام آباد



منظر اک بلندی پر : شکر پڑیاں کی تاریخی پہاڑی جہاں ۱۹۶۰ء میں صدر پاکستان اور ان کی کابینہ نے پہلی بار نئے دارالحکومت کے ابتدائی عظیم منصوبے پر غور کیا۔



...: وہ دفتر جہاں ... کسان اور زمیندار ... اپنی واگزار کی ... ہوئی زمینوں کا ... معاوضہ یا ان کے ... عوض میں جگہ ... لینے آتے ہیں۔ ↓

نقش ہائے رنگ رنگ : ایوان صدر اور سیکریٹیریٹ کی عمارات (ماڈل)

ز پس پردہ ہویدا : شاندار کشادہ سڑکوں کی داغ بیل







ادارہ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا ۔
مطبوعہ مشہور آفسٹ لیتھو پریس، میکلوڈ روڈ کراچی ۔ مدیر: ظفر قریشی